انتہاؤں میں رابطہ۔۔۔۔۔۔۔۔ پرنٹ اور ڈیجیٹل ایک ساتھ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

چیف ایڈیٹر: محمود شام

134

اکتوبر 2025

Editorial

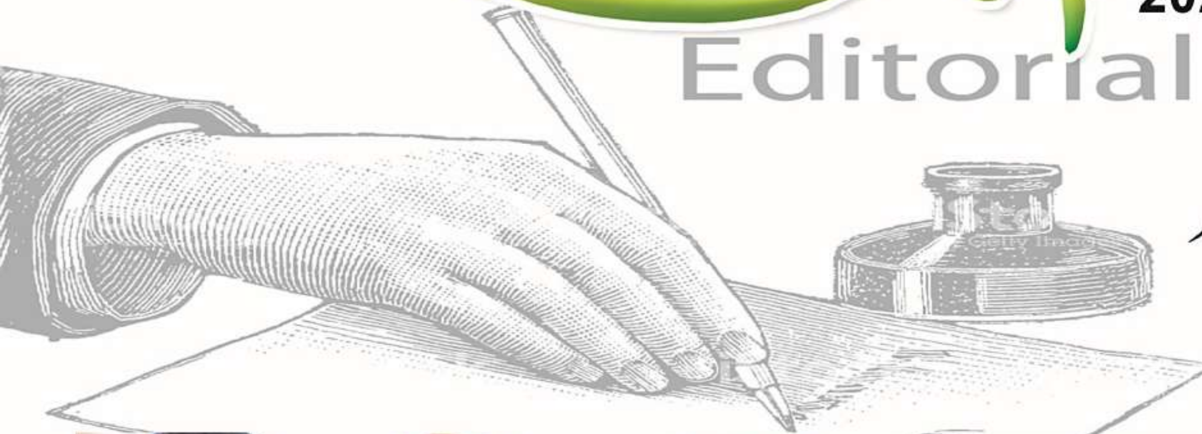

اخباری اداریہ نمبر

اداریے کی طاقت اداروں سے پوچھیں

قیمت: پاکستان میں 500 روپے۔۔۔۔ بیرون ملک :5 ڈالر (ای میگزین سالانہ 20 ڈالر)

ماہنامہ اطراف کراچی

سیاحت نمبر نومبر میں

پاکستان میں سیاحت کا فروغ، ریاست کی اہم ذمہ داری
سندھ میں روحانی، تاریخی، تفریحی سیاحت

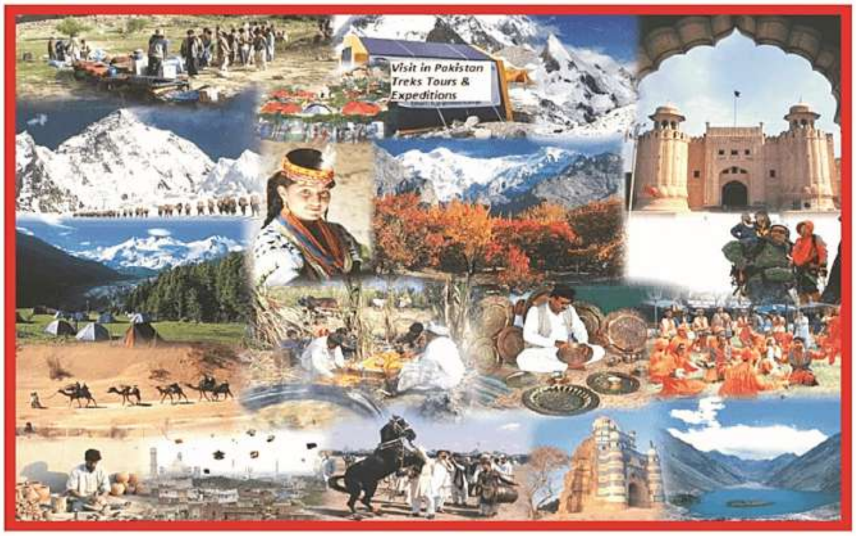

- خصوصی انٹرویوز
- تصاویر، مضامین
- ٹریول ایجنٹس ایسوسی ایشن پاکستان کے صدر کیا کہتے ہیں۔
- ٹور آپریٹر کو درپیش مسائل

- موٹر سائیکل پر سندھ دکھانے والے وی لاگرز
- آپ بھی اپنی تحریریں ارسال کر سکتے ہیں۔
- ٹریول ایجنٹس، ٹور آپریٹرز، وی لاگرز، سفرنامہ نگاروں کے لیے ایوارڈز کی خصوصی تقریب

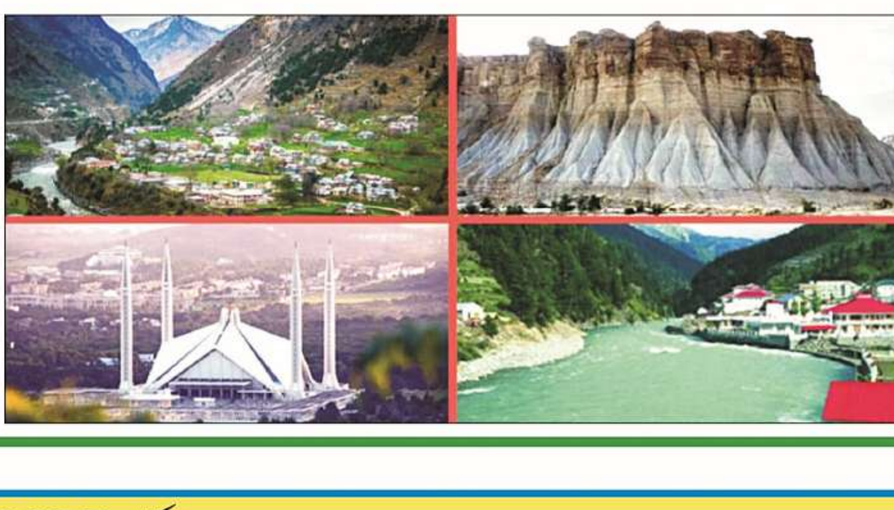

معلومات کیلئے
اپنی تحریروں کے لیے رابطہ نمبر:
0300-8210636

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد 12: شمارہ: 10

اکتوبر-2025

قیمت فی پرچہ: 500 روپے۔ سالانہ: 5000 روپے۔ بیرون ملک۔ 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر: محمود شام

ایڈیٹر: خان ظفر افغانی

پروجیکٹ ہیڈ ''اطراف'' ڈجیٹل: رخشندہ محمود

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا) عاصم متین خان (نیویارک)

نمائندہ خصوصی: محمد اجمل (کوئٹہ) بیورو چیف: پروفیسر شاداب احمد صدیقی (حیدر آباد)

مارکیٹنگ: محمد آصف 0331-0063311 عکاسی: شکیل قریشی

سرکولیشن مینجر: راجہ شاہد 0300-8210636

اکتوبر خاص

اداریہ کیوں بند کیا جا رہا ہے (ڈاکٹر سیّد جعفر احمد) 11-14

مصنوعی ذہانت نہیں پاکستانی ذہانت — اطرافیہ — 05

تحریکِ آزادی ہند میں اخباری اداریوں کا کردار — ☆ پروفیسر اختر الواسع — 7-10

ادارتی صفحہ: تاریخ سے زوال تک — غلام حیدر شیخ کی خصوصی تحریر — 15-19

امریکی اخبارات کے اداریے — ☆ عاصم متین خان — 21-24

بلوچی اخبارات کے اداریے — وحید زہیر — 25-26

سندھی اخبارات میں اداریے کی اہمیت — ☆ جاوید مہر کی اہم تحریر — 27-29

پنجابی اخبارات کے اداریے — ☆ اخلاق احمد ساغر — 30

پشتو اخبارات کے اداریے — ☆ ناصر علی سیّد — 31-32

اداریے سے میرا تعلق 1957 سے — ☆ محمود شام — 33-34

عمر کا سورج — ☆ سعیدہ افضل — 45-47

مجھے یاد ہے ذرا ذرا — ☆ مہناز حسن زیدی — 49-52

پھر عمرے کی سعادت حاصل — ☆ جہاں آراء — 57-61

مراسلات۔ حقیقی رائے عامہ — ☆ ذکیہ عباسی — 64-66

تذکرہ کتابوں کا — ☆ خان ظفر افغانی — 80-82

ظفر محمد خان ظفر خلائی سائنسدان ممتاز شاعر — ☆ سنیئر صحافی اختر سعیدی کی گفتگو — 83-90

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت: اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

EMPOWER HEALING WITH YOUR ZAKAT

PAKISTAN EYE BANK SOCIETY
PEBS
PEBS HOSPITAL

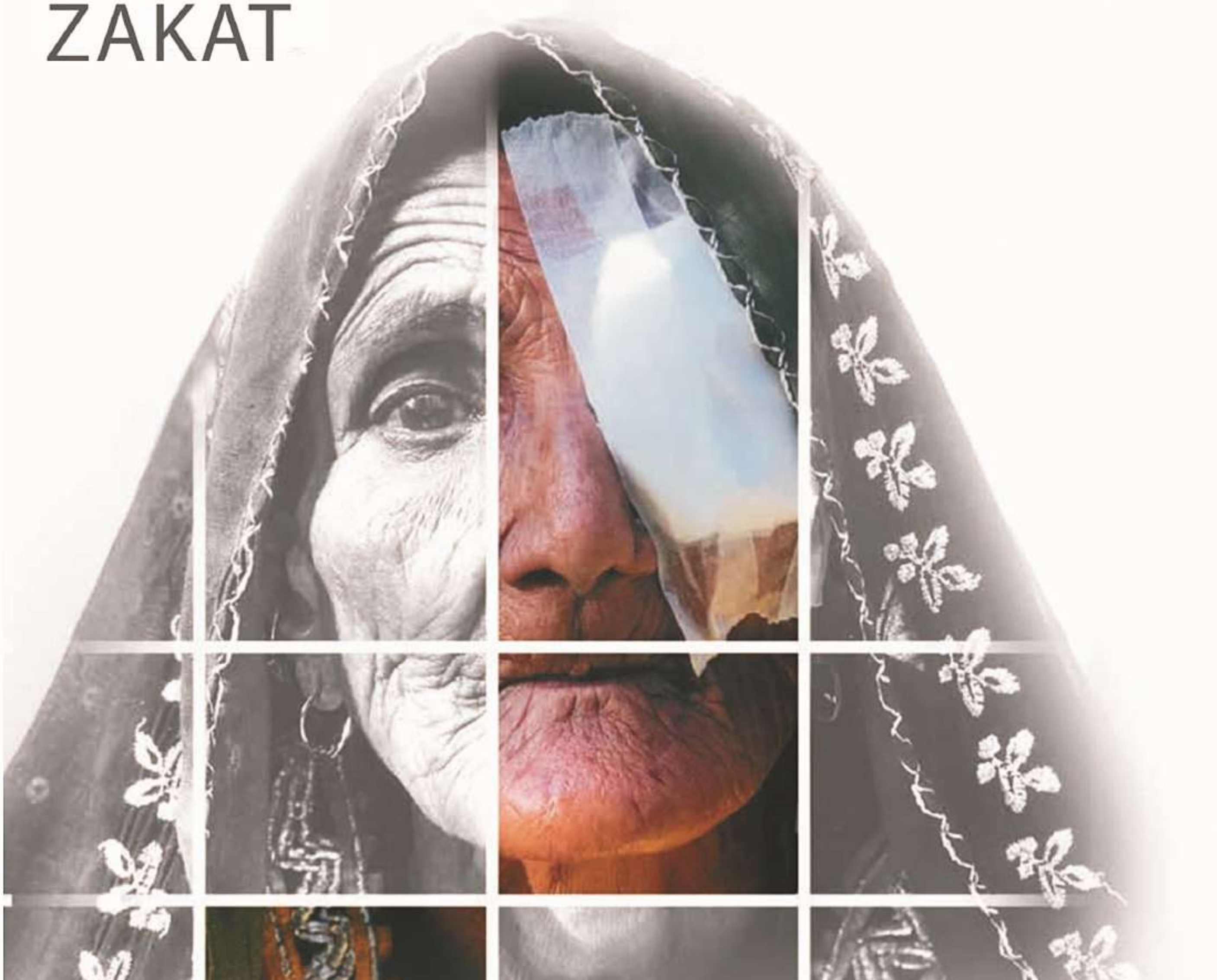

DONATION VIA BANK DEPOSIT

FOR ZAKAT
Meezan Bank Ltd.
PK97 MEZN 0099210102450686

FOR DONATION
Allied Bank Ltd.
PK10 ABPA 0010011795080021

FREE ORAL CANCER SURGERIES
Habib Bank Ltd.
PK29 HABB 000 7860079659003

DONATE ONLINE

ST - 19/7 , Sector 14B, Shadman Town , North Karachi
Info@pakistaneyebank.org.pk www.pakistaneyebank.org.pk 0213 6908053

"مصنوعی ذہانت نہیں پاکستانی ذہانت"

پہلے ہم پر جہالت غلبہ پاتی تھی اب مصنوعی ذہانت حاوی ہورہی ہے۔

مصنوعی جہانت کا ملبہ ہم بخوشی اپنے آپ پر گرار ہے ہیں اور بہت مطمئن ہیں۔ یہ ذہانت یہ ذخیرہ الفاظ یہ اطلاعات معلومات کس رخ سے تیار ہورہی ہیں۔ان میں کون سے زاویے مختص کیے جارہے ہیں۔ہم اس تصدیق کی زحمت نہیں کررہے ہیں۔ ہم پہلے بھی غیر ملکی نصاب نسل در نسل پڑھاتے آرہے ہیں ابھی یہ مصنوعی ذہانت اوراس کے ایلگو ردم سے مسحور ہورہے ہیں۔ڈالر کمانے کی ہوس بھی ہے اور دوڑ بھی۔اس کے لیے جسم زبان اپنی توانائیاں استعمال کررہے ہیں۔مقصد چند ثانیے کی اچھل کود ہے۔اس میں اخلاق حیا حرمت قربان ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ ہماری ان بے مقصد حرکتیں مہمل الفاظ سے امریکہ میں بیٹھے فیس بک ٹویٹر اور دوسرے رابطوں کے مالکان دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں شمار ہورہے ہیں۔ پہلے بھی ہم اور ہمارے حکمران ان طاقتوروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بن کر خوش ہوتے رہے ہیں۔ہمیں واہگہ سے گوادر تک کے اپنے 25 کروڑ ہم وطنوں کی خوشنودی نہیں.وائٹ ہاؤس اور 10 ڈاؤننگ سٹریٹ کی خوشنودی کی فکر رہتی ہے۔ ہمارے 47 فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے ہیں۔ چھ کروڑ شدید مفلسی میں مبتلا ہیں لیکن ہم پورے پورے جہاز لے کر ملکوں ملکوں گھومتے رہتے ہیں۔اس طرح مزید لوگ روزانہ غربت کی لکیر سے نیچے جاتے ہیں۔

حقیقی ذہانت کو الوداع کہا جارہا ہے نظریات سے جان چھڑائی جارہی ہے اس وقت ہم اپنی اس عظیم مملکت کو کیا نام دیں گے۔امیر،فلاحی،شاہی،جمہوری کامیاب۔ ہماری شناخت کیا ہے۔ہمارا آئین کن شقوں پر کھڑا ہے ہماری عدلیہ انصاف کی کن اقسام کو فروغ دے رہی ہے۔ دولت کی نئی نئی شکلیں سامنے لائی جارہی ہیں۔اکثریت کو کیا پتہ کرپٹو کرنسی کیا ہے بٹ کوائن کیا ہیں۔تدبر فراست اصول حرمت نزاکت لغت سے نکالے جارہے ہیں۔

کچھ لوگ خبط بصیرت میں آگے بڑھ رہے ہیں کسی کو زعم قیادت ہے۔قحط دانش ہے۔ آگہی کا خمار ہے۔درویشی بھی عیاری ہے سلطانی تو ہے ہی۔کہیں مفاہمت کا فریب دے کر اختیارات غصب کیے جارہے ہیں۔لوگ کوئی سمت متعین کیے بغیر جہد لا حاصل کررہے ہیں۔شوق رائے گانی غالب ہے کسی کو غرور زہد ہے۔کسی کو منصب کا فتور۔

ایک قدر مشترک اب طاقت کے سب سرچشموں میں ہے۔ واشنگٹن ہو کہ بیجنگ۔دہلی ہو کہ اسلام آباد ریاض ہو کہ ابوظہبی۔ ماسکو ہو یا پیرس اب اکثریت کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔عالمی دارالحکومت میں پہلے صدور جمہوریت کے غم میں دبلے رہتے تھے اب وہاں صرف ڈیل کا غلبہ ہے۔انسانوں کو ان ڈیلوں کا چارہ بنا دیا گیا ہے کبھی نیتن یاہو کے آگے یہ چارہ ڈالا جاتا ہے کبھی عرب سربراہ یہ چارہ ٹرمپ کے آگے سجا دیتے ہیں۔اب سرد جنگ ہے نہ گرم۔لیکن انسانوں کا قتل عام جاری ہے فلسطین کا لہو سب سے سستا ہے۔سرپرستی امریکہ کررہا ہے۔ ہر روز بچے مائیں بزرگ جوان امریکی اسلحے سے ہلاک کیے جارہے ہیں۔

اب کوئی برٹرینڈ رسل ہے نہ ژاں پال سارتر نہ کوئی جمال ناصر۔ بازاروں میں دکانیں کھلی ہیں انسانیت کی سیل لگی ہوئی ہے۔اس لیے دانش خرد بصیرت مروت سب غیر ضروری ہوگئے ہیں۔رابطے کی ٹیکنالوجی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے مگر چنگیزی اور تاتاری لشکروں کی طرح انسانی اقدار کو روندتے ہوئے۔

کہا جارہا ہے کہ اداریہ پڑھا نہیں جاتا سوال تو یہ ہے کہ کیا اداریہ لکھا بھی جارہا تھا۔یہ تو چند انچ میں کچھ سطریں کھپائی جاتی تھی.جب بات دل سے نہیں کہی جارہی تو دل میں اترتی کیسے؟ لیکن "اطراف" مایوس نہیں ہے پاکستان کی سرزمین میں عوامی ذہانت صدیوں سے راج کررہی ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام داتا گنج بخش،شاہ لطیف، بلھے شاہ، سلطان باہو،شاہ حسین ،میاں محمد بخش،شہباز قلندر، سچل سرمست،مست توکلی،رحمان بابا کا کلام ذہنوں میں دلوں میں گونجتا ہے اقبال ولولہ تازہ دیتا ہے۔ ہمارے نوجوان اس عوامی ذہانت اور سوشل میڈیا کی طاقت ملا کر اس خطے کی پاسبانی کریں گے۔ پاکستان کا مستقبل روشن بھی ہے اور مستحکم بھی۔صرف جسمانی عسکری اعتبار سے نہیں فکری بھی اور قدرتی وسائل کے حوالے سے بھی۔

بلوچستان،سندھ کے پی کے، پنجاب جنوبی پنجاب آزاد جموں وکشمیر گلگت بلتستان کے جوان بہت ذہین ہیں یہ علاقائی ذہانتیں سوشل میڈیا پر ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں اور ایک پاکستانی ذہانت تشکیل پارہی ہے۔

محمود شام

کفالتِ یتیم سے --- جنت کا حصول بھی --- رفاقتِ رسول ﷺ بھی
الخدمت
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
دُعا
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ و عطیات دے کر شامل ہو جائیں۔۔۔ لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

”ماہنامہ اطراف کے ”اخباری اداریہ نمبر“ کے لیے ہم نے نئی دہلی میں بہت احترام سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایمریٹس (اسلامک اسٹڈیز) پروفیسر اختر الواسع سے درخواست کی کہ وہ اردو صحافت کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہمیں برصغیر کی تحریکِ آزادی میں اردو اخبارات کے اداریوں کے انقلابی کردار پر خصوصی تحریر عنایت کریں۔ پروفیسر اختر الواسع ”اطراف“ کے قلمی سرپرست ہیں۔ اردو کے دلدادہ پاکستان کئی بار آچکے ہیں۔ دونوں ملکوں میں قربت اور مفاہمت کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے ہمیں ایک جامع تحریر سے نوازا اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جودھپور میں مولانا ابوالکلام یونیورسٹی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔“

ملکی آزادی میں بنیادی کردار اُردو صحافت کا

پروفیسر اختر الواسع کی دہلی سے خصوصی تحریر

آزادی کی اہمیت اور اس سے مرتب ہونے والے مثبت اثرات سے کسی بھی سماج، معاشرے اور قوم کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا تو ان کے تسلط سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستان کے رہنے والوں نے مل جل کر سعی کی بالآخر انگریزوں کے تسلط سے ملک آزاد ہوا اور آج ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ آزادی ایک نعمت عظمیٰ ہے اس لیے اس کی قدر کرنا نہایت ضروری ہے۔ آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ملک کی آزادی میں بنیادی کردار اُردو صحافت کا بھی رہا ہے۔ اور اس وقت اُردو اخبارات میں جو اداریے تحریر کیے جاتے تھے ان میں آزادی کے تئیں عوام کے اندر جذبہ پیدا کیا جاتا تھا۔ اردو اخبارات میں خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد کا البلاغ اور الہلال، مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد، صدق جدید وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اخبارات میں لکھے گئے اداریے بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ کیونکہ اداریہ صحافت کا وہ ستون ہے جس کے ذریعے اخبار یا رسالہ اپنے موقف، فکر اور نظریے کو قارئین تک پہنچاتا ہے۔ یہ محض خبری تحریر نہیں ہوتا بلکہ اس میں حالاتِ حاضرہ پر تجزیہ، رہنمائی اور رائے شامل ہوتی ہے۔ اداریے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ قاری کو خبر کے پس منظر اور اس کے نتائج سے روشناس کراتا ہے، تاکہ وہ محض واقعہ نہ پڑھے بلکہ اس کے اثرات اور اس کی حقیقت کو بھی سمجھے۔ اداریہ عوامی رائے سازی میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اخبار کے قاری کے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اداریہ ان سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے اور ایک جامع نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ اس طرح یہ عوام کو درست سمت میں سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اداریہ قوم کی فکری تربیت بھی کرتا ہے، کیونکہ اس میں علمی استدلال، ادبی خوبصورتی اور صحافتی بصیرت پائی جاتی ہے۔

تاریخ پر نظر ڈالیں تو آزادی کی تحریک میں اداریوں نے ایک انقلابی ہتھیار کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ انگریز حکومت کے خلاف عوامی بیداری پیدا کرنے، قربانی اور جدوجہد کے جذبے کو ابھارنے میں صحافیوں کے اداریے سنگِ میل ثابت ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ سامراجی قوتیں اداریوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتی تھیں۔ اداریے کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ یہ اخبار یا رسالے کی شناخت بن جاتا ہے۔ قاری خبر کو کسی بھی ذریعہ سے حاصل کرسکتا ہے، مگر ادارتی رائے اور تجزیہ صرف اسی ادارے سے جڑا ہوتا ہے۔ یہی ادارتی موقف اخبار کو باقی اخبارات سے ممتاز کرتا ہے۔

الغرض، اداریہ صحافت کی روح ہے۔ یہ عوام کے شعور کو بیدار کرتا ہے، مسائل کی گہرائی کو واضح کرتا ہے، اور قوم کو سمت دینے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس کے بغیر اخبار محض خبری صفحات کا ایک مجموعہ رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس حقیقت کا بھی بخوبی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اردو اخبارات کے اداریوں نے اس جدوجہد کو پروان چڑھانے، عوامی شعور بیدار کرنے اور غلامی کے خلاف ایک مشترکہ آواز بلند کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ برصغیر میں جب قومیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں اور انگریز اپنی استعماری پالیسیوں کے ذریعے عوام کے

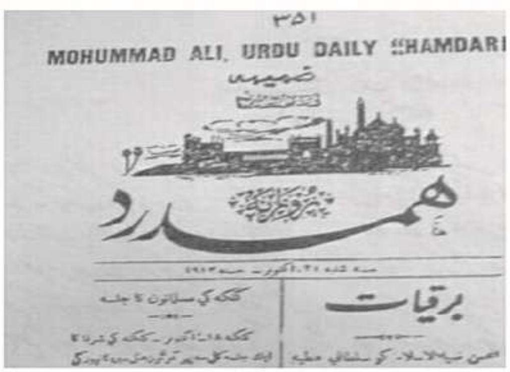

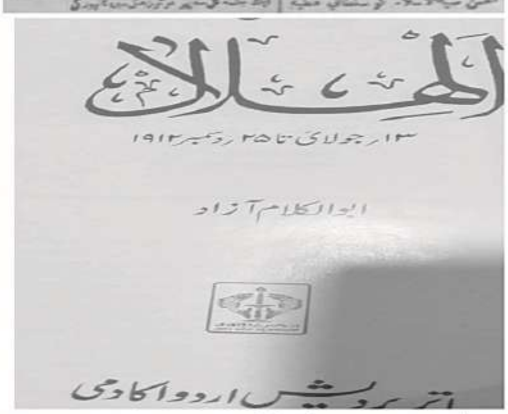

AJ Express
Travel Agency
Since 2018
LICENSED
A.J EXPRESS
Travel Smart With Experience
Our Services:
WORLDWIDE VISA SERVICES
UMRAH PACKAGES
INTERNATIONAL PACKAGES
DOMESTIC PACKAGES
AIR TICKETING
FROM VISA AND TICKETING TO UMRAH, DOMESTIC, AND INTERNATIONAL TOURS
WE'VE GOT YOU COVERED. BOOK NOW!
www.ajexpress.com.pk
Head Office:
Office No. 404, Qurtaba Mall, Bahadurabad ,Karachi.
BTK Office: Office No. 510,Dominion Business Center, Jinnah Ave, Bahria Town Karachi.
Contact Us
+92 332 9999047

ابلاغ۔الہلال، ہمدرد، صدق جدید کے اداریے

وسائل لوٹ رہے تھے، اُس وقت اردو اخبارات اور رسائل لکھے گئے اداریوں نے عوام کے دلوں میں آزادی کی چنگاری روشن کی۔ اردو صحافت کی ابتدا1822ء میں "جامِ جہاں نما" سے ہوئی، لیکن ابتدا میں اخبارات زیادہ تر سماجی، تعلیمی اور تہذیبی موضوعات تک محدود تھے۔ رفتہ رفتہ حالات نے انہیں سیاسی اور قومی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ صحافت چونکہ عوام تک رسائی کا سب سے مؤثر ذریعہ تھا، اس لیے اخبارات جلد ہی آزادی کی جدوجہد کا سب سے مضبوط ہتھیار بن گئے۔

1857 کی جنگ آزادی میں بھی اردو اخباری اداریوں کا انقلابی کردار

1857ء کی پہلی جنگِ آزادی میں اُردو اخبارات کے اداریوں نے انقلابی کردار ادا کیا۔ دہلی اردو اخبار، مولوی محمد باقر کی ادارت میں، انگریزوں کے خلاف بغاوت کی کھلی دعوت دیتا رہا۔ ان کی جرات مندانہ تحریروں کے نتیجے میں انگریز حکومت نے اخبار بند کیا اور مولوی باقر کو شہید کر دیا۔ یہ قربانی اردو صحافت کی تاریخ میں سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح دیگر چھوٹے بڑے اخبارات نے بھی عوامی بیداری میں بھرپور کردار ادا کیا اور جنگِ آزادی کی فضا کو گرمائے رکھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت تحریکِ آزادی کی اصل آواز بن گئی۔ اس دور میں ایسے صحافی اور رہنما سامنے آئے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کے دلوں میں انگریز دشمنی کو مزید مضبوط کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" صرف ایک اخبار نہیں بلکہ تحریکِ آزادی کا ترجمان تھا۔ اس کے اداریے اور مضامین نوجوانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتے اور غلامی کے خلاف بغاوت کے جذبات کو ابھارتے۔ انگریز سرکار نے "الہلال" پر بارہا پابندی لگائی لیکن آزاد کے عزم کو توڑ نہ سکی۔

برصغیر کی تحریکِ آزادی میں اردو صحافت نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان اخبارات میں سب سے نمایاں مقام مولانا ابوالکلام آزاد کے نکالے ہوئے اخبار الہلال کو حاصل ہے۔ 1912ء میں شروع ہونے والا یہ اخبار محض ایک صحافتی اشاعت نہیں بلکہ آزادی کا فکری اور انقلابی منشور تھا۔ اس کے اداریے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تحریر کیے جاتے تھے۔ الہلال کے اداریوں میں غلامی کو بدترین لعنت اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت قرار دیا گیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

" آزادی انسان کی وہ دولت ہے جسے کھو کر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ غلامی موت ہے، اور آزادی ہی زندگی ہے۔" یہ الفاظ عوام کے دلوں میں انقلابی آگ بھڑکاتے اور انہیں قربانی کے لیے تیار کرتے تھے۔

اداریوں میں قوم کو بار بار یہ یاد دلایا گیا کہ وہ اس سرزمین کے وارث ہیں اور اگر غلامی پر راضی رہے تو آنے والی نسلیں انہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ایک اداریے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

" ہم اس سرزمین کے وارث ہیں، جس پر ہماری نسلوں نے خون بہایا ہے۔ اگر آج ہم غلامی قبول کریں تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔"

مولانا آزاد نے اداریوں میں آزادی کی جدوجہد کو اسلام کے پیغام کے ساتھ جوڑا۔ ان کے مطابق اسلام نے ظلم کے خلاف کھڑا ہونا

سکھایا ہے، اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ غلامی کے خلاف آواز بلند کریں۔ جیسا کہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" اسلام نے ہمیں ظلم کے خلاف کھڑا ہونا سکھایا ہے۔ کیا ہم اس تعلیم کو فراموش کر بیٹھیں اور ظالم کے سامنے سر جھکا دیں؟" الہلال کے اداریوں نے آزادی کو مشترکہ قومی مقصد قرار دیا اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ مولانا آزاد نے لکھا:

" ہندوستان کی آزادی صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہر باشندے کا حق ہے۔ جب تک ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں اٹھیں گے، یہ غلامی کی زنجیریں نہیں ٹوٹ سکتیں۔"

یہ اداریے اس بات کا ثبوت ہیں کہ الہلال محض ایک مذہبی یا فرقہ وارانہ اخبار نہیں تھا بلکہ ایک قومی اور متحدہ ہندوستان کی آواز تھا۔ الہلال کے اداریوں میں انگریز حکومت کی استعماری پالیسیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ معیشت کی بربادی، وسائل کی لوٹ مار اور تعلیم میں گمراہ کن پالیسیوں کو اجاگر کیا گیا۔ ایک اداریے میں کہا گیا:

" انگریز ہماری دولت لوٹ رہا ہے، ہماری محنت کو برباد کر رہا ہے اور ہماری روحوں کو غلام بنا رہا ہے۔ کیا ہم اب بھی خاموش رہیں گے؟"

صحیح بات یہ ہے کہ الہلال کے اداریے برصغیر کی تحریکِ آزادی کے لیے فکری ہتھیار ثابت ہوئے۔ ان میں قوم کو بیدار کرنے، غلامی کے خلاف کھڑا کرنے، ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت واضح کرنے اور انگریز حکومت کے خلاف عوامی جذبات ابھارنے کا پیغام دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جلد ہی الہلال پر پابندی لگا دی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ اداریے عوام کے دلوں میں بغاوت کی آگ روشن کر رہے ہیں۔

اسی طرح مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" کے ذریعے آزادی کی جنگ میں نئی روح پھونکی۔ ان کے اداریے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے اور برطانوی پالیسیوں کی شدید مخالفت کرتے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں اداریے لکھ کر تحریک آزادی کو تقویت بخشی، وہ مہاتما گاندھی کی قوم وملت کے تئیں ہمدردی سے کافی متاثر ہوئے اور وہ کھل کر ان کی حمایت تحریر وتقریر کے ذریعہ کرنے لگے۔ وہ گاندھی جی کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں فخر ہندستان کے لقب سے پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاید ہی کوئی ہندستانی شخص ہوگا جو ایسے مرد مجاہد سے واقف نہ ہو۔ جب جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو ہندوستان کی حمایت کرنے کے الزام میں تیسری مرتبہ گرفتار کرلیا گیا تو مولانا محمد علی نے اپنے اخبار "ہمدرد" کے اداریہ میں اس تعلق سے احتجاج درج کیا:

"سرزمین ہند میں آج کون فرد ہے جو آج سپہ سالار حق وصداقت کے نام نامی سے واقف نہیں۔ یہ وہ فخر ہند نوجوان ہے جو مادر وطن کی عزت وجائز احترام برقرار رکھنے کی خاطر آج تیسری بار جنوبی افریقہ کے جیل خانوں میں وہاں کی گوری آبادی کے ہاتھوں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔" (روزنامہ ہمدرد، ۱۳، دسمبر۔۱۹۱۳)

مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد میں اداریوں سے تحریکِ آزادی میں نئی روح پھونکی

یہ بات آچکی ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں صحافت کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اخبارات نے قوم کو بیدار کرنے، انگریزوں کے مظالم کو بے نقاب کرنے اور عوام کو آزادی کی جدوجہد کے لیے

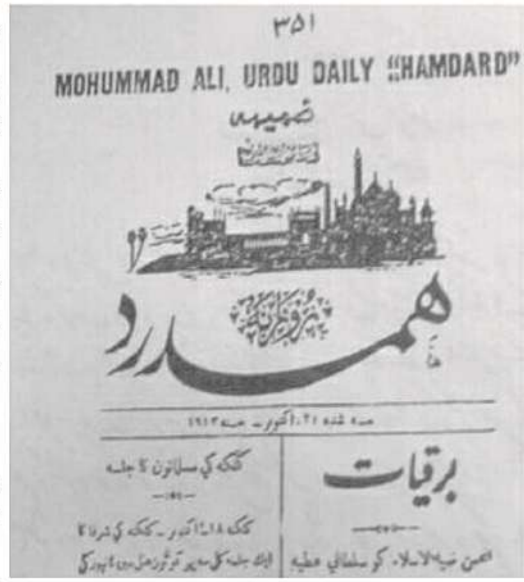

منظم کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں تھیں۔ ان ہی اخبارات میں "صدقِ جدید" ایک ایسا جریدہ تھا جس نے اپنے جرأت مندانہ اور بامقصد اداریوں کے ذریعے تحریکِ آزادی کو نئی قوت بخشی۔ یہ اخبار 1920ء میں مولانا محمد علی جوہر نے لکھنؤ سے جاری کیا۔

"صدقِ جدید" کے اداریے اپنی فصاحت و بلاغت، قومی جذبے اور انقلابی پیغام کی وجہ سے بہت جلد عوام میں مقبول ہو گئے۔ ان اداریوں کے ذریعے مولانا محمد علی جوہر نے نہ صرف آزادی کے تصور کو عام کیا بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی تحریک کو ایک فکری اور علمی بنیاد فراہم کی۔ ان تحریروں میں ہندوستانی عوام کو یہ احساس دلایا گیا کہ وہ صدیوں پرانی تہذیب اور شان و شوکت کے وارث ہیں اور غلامی ان کے شایانِ شان نہیں۔ ان اداریوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عوام کو تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون میں فعال حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا تا کہ انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنایا جا سکے۔ یہ اداریے عوامی جذبات کے ترجمان تھے جنھوں نے ہر طبقے کو آزادی کی جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کیا۔

انگریز حکومت نے ان اداریوں کی کاٹ کو خوب محسوس کیا، اسی لیے "صدقِ جدید" پر بھی کئی بار پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن عوامی سطح پر اس اخبار کی مقبولیت اور مولانا محمد علی جوہر کے جوشیلے اندازِ تحریر نے اسے تحریکِ آزادی کے ایک مضبوط فکری ہتھیار کی شکل دے دی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ "صدقِ جدید" کے اداریے ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں ایک روشن باب ہیں۔ ان کی بدولت عوام میں آزادی کا جوش بڑھا، قومی شعور بیدار ہوا اور غلامی کے خلاف ایک مضبوط آواز بلند ہوئی۔ یہ اداریے نہ صرف تحریکِ آزادی کے لیے اہم تھے بلکہ آج بھی صحافت کی قوت اور ذمہ داری کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

اس لیے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اداریوں نے ہندوستانیوں کو آزادی کے لیے ابھارا، غلامی کے خلاف نفرت پیدا کی اور تحریکِ آزادی کو فکری بنیاد فراہم کی۔ ان اداریوں میں سیاسی بصیرت، ادبی چاشنی اور عوامی زبان کا ایسا امتزاج پایا جاتا تھا

زمیندار میں مولانا ظفر علی خان نے انگریزوں کو للکارا

جو قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈالتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں آزادی کو محض سیاسی ضرورت نہیں بلکہ قومی بقا اور دینی فریضہ قرار

دیتے تھے۔ ان کے اداریے غلامی کے نقصانات اور آزادی کے فوائد کو اس انداز میں اجاگر کرتے کہ عوام کے دلوں میں قربانی کا جذبہ اور حوصلہ دوچند ہوجاتا۔ ان کے اداریوں کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ محروم اور مظلوم طبقوں کی آواز بنے۔ وہ عوام کو یہ احساس دلاتے کہ برطانوی سامراج صرف سیاسی محکومی نہیں بلکہ تہذیبی، سماجی اور معاشی زنجیر بھی ہے۔ اس شعور نے آزادی کی تحریک کو عوامی سطح پر وسعت دی۔ ان اداریوں میں طنز، استدلال اور فکری قوت ایسی تھی جس سے انگریز حکومت لرزاں رہتی اور عوام کو اپنی منزل واضح دکھائی دیتی۔ یہ اداریے تحریکِ آزادی کے فکری اور تحریکی سرمایہ ثابت ہوئے۔ اس وقت کی لکھی گئیں تحریریں آج بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ مؤثر ہے اور

مولانا ابوالکلام آزاد کے اداریے آزادی کا منشور

اداریہ محض صحافتی صنف نہیں بلکہ ایک انقلابی ہتھیار بھی بن سکتا ہے۔ اسی طرح "زمیندار" میں مولانا ظفر علی خان نے عوامی مسائل کو اجاگر کیا اور اپنی جرأت مندانہ صحافت کے ذریعے انگریزوں کو للکارا۔ "اردوئے معلّیٰ" جیسے اخبارات نے بھی آزادی کے شعور کو عام کیا۔

یقینی طور پر اردو اخبارات کے اداریوں نے عوام کو یہ احساس دلایا کہ غلامی ایک لعنت ہے اور آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ اخبارات کے اداریے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرتے اور انہیں یہ باور کراتے کہ اگر ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں تو انگریزوں کو شکست دینا ممکن ہے۔ اس اتحاد کے پیغام نے آزادی کی تحریک کو نئی طاقت بخشی۔ اردو اخبارات کو اس راہ میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریز حکومت اخبارات پر پابندیاں لگاتی، ایڈیٹروں کو قید و بند کی صعوبتیں دیتی، بھاری جرمانے عائد کرتی اور بعض اخبارات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیتی۔ لیکن اردو صحافیوں نے ہمت نہ ہاری۔ ان کی قربانیاں اس بات کی گواہی ہیں کہ آزادی کی قیمت جان و مال سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو صحافت اور اس میں لکھے جانے والے اداریئے محض خبروں کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ یہ ایک انقلابی پلیٹ فارم تھے جس نے عوامی رائے عامہ کو ہموار کیا، سیاسی شعور پیدا کیا اور غلامی کے خلاف بغاوت کو منظم کیا۔ اردو اخبارات کے اداریے اور تحریریں عوام کے دلوں میں امید، حوصلہ اور جذبہ آزادی جگانے کا سب سے بڑا ذریعہ بنیں۔ یہ اردو صحافت ہی تھی جس نے آزادی کی شمع روشن رکھی اور قربانیوں کی ایسی داستانیں رقم کیں جو آج بھی ہندوستان کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

اداریہ کیوں بند کیا جارہا ہے

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد ملک کے ممتاز دانشور، محقق، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اظہارِ خیال کرنے والے۔ ماہنامہ اطراف کے قلمی سرپرست۔ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ پاکستان اسٹڈیز کے سربراہ رہے ہیں۔ اب انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ کے ڈائریکٹر ہیں۔ پاکستان کو درپیش مسائل پر تحقیقی رپورٹس بھی شائع کر رہے ہیں۔ اہم تصنیفات بھی نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ ہماری درخواست پر اخباری اداریوں پر انتہائی تحقیقی تحریر سے نواز رہے ہیں کہ اداریہ کیوں لکھا جاتا تھا۔ اب اداریہ کیوں بند کیا جارہا ہے۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

مزاحمتی اداریے۔ ہماری تاریخ کا اہم اثاثہ

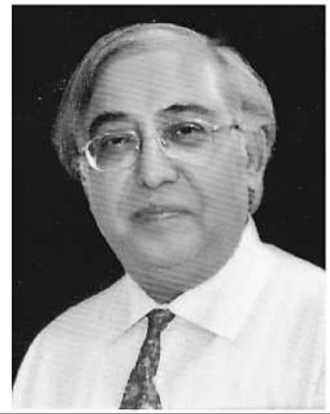

تحریر: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

'روزنامہ جنگ' نے اداراتی صفحے سے 'اداریہ' ختم کر دیا ہے (لیکن صفحے کو اب بھی 'اداراتی صفحہ' ہی کہا جارہا ہے۔ صفحۂ اول پر اس صفحے کے کالموں اور کالم نگاروں کے نام اشتہار کے طور پر جس باکس میں دیے جاتے ہیں وہ ان مشمولات کے صفحے کو 'اداراتی صفحہ' ہی لکھ رہا ہے۔) اخبار کے اجراء کے وقت سے چھپنے والے اس اداریے کو ختم کیوں کر دیا گیا؟ اخبار نے اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی۔ شاید اس کو ضروری بھی نہیں سمجھا گیا۔ اگلے چند روز میں کچھ کالم نگاروں نے اس پر خامہ فرسائی بھی کی، سوشل میڈیا پر بھی خوب بحث ہوئی، مگر صورت یہ ہے کہ کچھ دنوں میں یہ اقدام بہرحال موضوع گفتگو نہیں رہے گا۔ اداریہ تو ختم ہوا۔ اس کو ختم کرنا مقصود تھا، یہ کر دیا گیا۔ مگر سوال تو بہرحال موجود رہے گا کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ صحافت کی تاریخ کا ایک اور موڑ ہے، صحافت کے طالبعلم یہاں رکیں گے تو ضرور۔

زیرِ نظر مضمون میں اس فیصلے، اس کے اسباب اور اس بات پر کہ اداریہ ہوتا ہی کیوں تھا؟ پر کچھ گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

'جنگ' نے جو فیصلہ کیا ہے، باہر کے بعض اخباروں نے بھی پچھلے چند برسوں میں ایسا ہی اقدام کیا ہے۔ امریکہ کے نیویارک ٹائمز نے اور ہندوستان کے بھی چند بڑے اخباروں نے اداراتی صفحے سے اداریے کو ختم کر دیا تھا لیکن اداریے کے اوپر چھپنے والی لوح کو برقرار رکھا گیا۔ 'جنگ' میں بھی یہ لوح موجود ہے۔ اسے اب مرحوم 'اداریے' کی لوحِ مزار کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ 'جنگ' کے مالکان اور ان کے اداریے کے مشیروں نے یقیناً دلیل کے طور پر باہر کے بعض انگریزی اخباروں کی مثال بھی پیشِ نظر رکھی ہوگی۔ یہ بھی امکان ہے کہ آئندہ دنوں میں 'جنگ' کی تقلید میں بعض دیگر اخبار بھی اداریے سے قطع تعلق کرلیں۔ جہاں تک اداراتی صفحے سے اداریے کو ختم کرنے کے 'جنگ' کے یا بعض دوسرے اخبارات کے فیصلے کا تعلق ہے اس کے چند اسباب جو زیرِ گردش رہے ہیں وہ کیا ہیں؟ ایک تو کہا جارہا ہے کہ اداریہ پڑھتا ہی کون ہے؟ دوسرا یہ کہ اداریہ صرف اس لیے چھاپا جاتا ہے کیونکہ یہ بہرحال شروع سے چھپتا چلا آیا ہے۔ تیسرا یہ کہ اداریہ جو جگہ گھیرتا ہے اس میں کوئی بہتر کالم چھاپا جاسکتا ہے۔ ایک زیادہ زور سے کہا جانے والا سبب یہ ہے کہ اب اخبار ہی کم پڑھے جارہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ نے اخبار کی جگہ لے لی ہے۔ ایک قاری علی الصبح جب اخبار کھولتا ہے تو وہی خبریں اس کو نظر نواز ہوتی ہیں جو وہ گزشتہ شام کو ٹیلیویژن اسکرین پر دیکھ چکا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت اگر وہ اخبار

ابتدا میں مالی امور اخبار کے اصل منصب پر حاوی نہیں تھے

کھولنے کے بجائے ٹی وی کے بٹن کو آن کرے تو گزشتہ دس بارہ گھنٹوں کی وہ خبریں بھی دیکھ سکتا ہے، جو اخباروں کے پریس میں جانے کے بعد سامنے آئی ہوتی ہیں۔

ان توجیہات میں سے بعض، بالخصوص آخری توجیہہ اس لائق ہے کہ اس پر بات کی جاسکے۔ جہاں تک کہ دیگر تاویلات کا تعلق ہے وہ یا تو محض تاثراتی باتیں ہیں یا اخباروں اور اُن اداریہ نویسوں کے طرزِ فکر کا مظہر ہیں جو اداریے کو خود بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اداریہ پڑھتا کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو اداریے صرف خانہ پری کے

DAWN

Monday, Dec. 25, 1972

Mountains don't cry

لیے نہیں لکھے جاتے بلکہ ان میں کوئی کام کی بات، کوئی اہم موقف یا کوئی اچھا تجزیہ پیش کیا گیا ہوتا ہے، وہ پڑھے بھی جاتے ہیں، اور ان کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں۔ اس گئے گزرے دور میں بھی جبکہ اخبارات بحیثیت مجموعی صحافتی روایات اور اقدار سے اور عشروں سے چلے آنے والے اپنے شعبوں سے دور ہوتے جارہے ہیں، بعض اخبارات کے اداریے اب بھی قارئین کے ناگزیر مطالعے کا حصہ بنتے ہیں، ان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ جن اخباروں میں قارئین کے خطوط کی جگہ ابھی ختم نہیں کی گئی، ان میں اداریوں پر تبصرے بھی

ہوتے ہیں۔ ایسے اداریے صرف اس لیے نہیں چھپتے ہیں کہ یہ روز اول سے چھپتے چلے آئے ہیں، بلکہ اس لیے چھپتے ہیں کہ ہر روز ان کی تازگی برقرار رہتی ہے۔ اداریے جگہ گھیرتے ہیں؟ یہ اگر واقعی اداریے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں تو یہ نہ صرف اچھا ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ رہا آخری سبب یا تاویل، یعنی یہ کہ سوشل میڈیا کے دور میں جبکہ اخبار ہی کی اہمیت کم ہوگئی ہے، اداریے کو بھی کیوں اتنی اہمیت دی جائے کہ اس کی اشاعت ضروری سمجھی جائے۔ اس آخری تاویل کو یہ مضمون آخر میں زیر بحث لائے گا۔ سر دست دو موضوعات ہمارے پیشِ نظر ہوں گے۔ ان پر بھی خامہ فرسائی کی گنجائش کیوں سمجھی گئی؟ یہ اس لیے کہ یہ بالآخر ہمیں اس آخری سوال ہی کو زیر بحث لانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اول یہ کہ اداریے کا مقصد کیا تھا اور ہے، اور دوئم یہ کہ ماضی میں اداریوں نے رول کیا ادا کیا؟ اداریے کا مقصد کیا ہے؟

اخباری اداریوں کا مقصد

اخبارات میں اداریے کا آغاز خود اخبارات کے اجراء کے ساتھ ہی ہوگیا تھا۔ جس فضا اور زمانے میں اخبار ایک نئے وسیلہ ابلاغ کے طور پر انسان کی تہذیبی زندگی کا حصہ بنا، اس زمانے میں صحافت بجائے خود ایک خود مختار (Autonomus) شعبہ تھی جس کا اپنا دائرہ کار تھا، جس کے اپنے اصول وقواعد تھے اور اپنی قدریں تھیں۔ بنیادی حقیقت اخبار اور قاری کا رشتہ تھا، اخبار قاری تک خبریں اور جائزے پیش کرنے کو اپنا فرض منصبی، اپنا اخلاقی منصب تصور کرتے تھے۔ ظاہر ہے اخبار کی اشاعت اور اس کی ترسیل کے لیے مالی وسائل کی بھی ضرورت تھی، لیکن وسائل کی یہ حقیقت یا مالی امور اخبار کے اصل منصب پر فائق نہیں تھے۔ اخبار صحافت ہی رہتے تھے، کاروبار اور صنعت نہیں بنے تھے۔ جب یہ صنعت بننا شروع ہوئے تو بتدریج صحافت کے سب ہی شعبے رفتہ رفتہ اس کے زیر اثر آتے چلے گئے، یہاں تک کہ صحافت مکمل طور پر ایک صنعت بن گئی۔ اخبار ایک کمپنی بن گیا، اس کے مختلف شعبے مختلف ڈائریکٹروں کے تحت استوار ہونے لگے۔

جب اخبار صرف صحافت تھے تو اداریہ اس کا سب سے اہم نہیں تو اس کے اہم ترین مشمولات میں سے ایک ہوتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ خبر کسی واقعے تک محدود ہوتی ہے۔ بہت سی خبریں بہت سے واقعات کی اطلاع دیتی ہیں مگر اداریہ، سب واقعات، یا سلسلہ' واقعات کا اجمالی جائزہ لیتا ہے، ان کا مجموعی طور پر احاطہ کرتا ہے، اور ان پر تبصرہ کرتا ہے۔ اداریہ زمانے کا عکس ہی نہیں، رفتارِ زمانہ کا اطلاع کنندہ بھی ہوتا ہے۔ اداریہ نویس کے سامنے خبر یا واقعے کے ساتھ ساتھ پس منظر کا ایک کینوس بھی ہوتا ہے جو اس کے اداریے کو' اداریہ' بناتا ہے۔

اردو اور ہندوستان کے معروف ادیب اور صحافی، حیات اللہ انصاری کے الفاظ میں:

"اداریہ ہو یا شذرات، دونوں کی عمارت اٹھتی ہے سماج کے بنیادی تصورات پر جو ایڈیٹر کے دماغ میں ہیں۔"

اب صحافت ایک صنعت
اخبار کمپنی بن گیا

اپنے مضمون میں آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ اداریہ نویس:

"دنیاوی تجربوں کے حدود میں رہ کر لکھتا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک اس کے پاس گہرے اصول نہ ہوں گے، اس کی تحریروں میں قرار نہیں ہوگا۔"

حیات اللہ انصاری کے ان الفاظ سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ایک اچھا ایڈیٹر اور اداریہ نویس وہ تھا جو بصارت اور بصیرت دونوں کا حامل تھا۔ بصارت اس کو زیر تبصرہ خبر کے حدودِ اربعہ اور واقعے کی جزئیات تک پہنچاتی تھی اور بصیرت اس کو اس واقعے کے پس منظر اور پیش منظر تک رسائی فراہم کرتی تھی۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر عہد اور ہر زمانے کا اور کسی بھی معاشرے کا ایک اجتماعی شعور اور اجتماعی بصیرت بھی ہوتی ہے۔ اخبار خبروں کے ذریعے معاشرے میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیوں اور ان کی آئے دن کی خبریت پر مشتمل تفصیلات کا احاطہ کرتا ہے، جبکہ اداریہ نویس معاشرے کے ضمیر کا کھوج لگاتا ہے اور اس کو اپنے انداز، اپنے طرز فکر اور اپنے ذوق کے مطابق اداریے میں جگہ دیتا ہے۔ اداریہ معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اداریہ نویسوں کے اپنے اپنے طرز ہائے فکر بھی ہوسکتے ہیں، اپنی نظر اور نظریے بھی ہوسکتے ہیں، سو ان سب کا فرق بھی اداریوں کے اندر اور اخبارات کے مزاج کے اندر منعکس ہوتا ہے۔

برطانیہ کے' ٹائمز'، 'ڈیلی ٹیلیگراف'، 'فنانشل ٹائمز'، بحیثیت مجموعی معاشرے کی قدامت پسند اور روایتی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں، 'گارڈین' اور 'انڈی پینڈنٹ' نسبتاً آزاد خیال اور لبرل رجحانات کے عکاس رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی 'نوائے وقت' شروع سے ایک روایتی، قدامت پسند اور ریاستی قومی بیانیے کو اپنا مسلکِ حیات بنائے رہا ہے۔ 'جنگ' کا یہ خیال رہا ہے کہ اس کو سب ہی نقطۂ ہائے نظر کو خبروں میں جگہ دینی چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس نقطۂ نظر کا سیاست یا ریاست میں غلبہ ہوتا ہے، اسی تناسب سے اس کو خبروں میں نمائندگی ملتی ہے۔ ایسے میں 'جنگ' کا اداریہ نویس بین بین ہی رہتا رہا ہے۔ یہی اس کے لیے قرین مصلحت بھی تھا اور کاروباری نقطۂ نظر سے ضروری بھی۔

اداریے کی اپنے عہد کی ترجمانی اور روحِ عصر کی نبض شناسی ہی کا نتیجہ تھا کہ اداریے کسی بھی دور کی تاریخ نویسی کا لازمی ماخذ بن گئے۔ تاریخ کے طالبعلم ماضی کے کسی بھی موضوع پر تحقیق کے دوران اُس وقت تک اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتے تھے جب تک کہ وہ اُس دور کے اخبارات کا مطالعہ نہیں کر لیتے تھے۔ ہماری تحریک آزادی کے زمانے کے اخبارات اور ان کے اداریے ہماری تاریخ کا بہت اہم بنیادی حوالہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال)، مولانا محمد علی جوہر (ہمدرد، کاریڈ)، مولانا ظفر علی خان (زمیندار)، غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک (انقلاب)، یہ ہماری تحریک آزادی کے دنوں کے رجحان ساز صحافی تھے۔ ان کے لکھے ہوئے اداریے تاریخ کا اثاثہ بن گئے۔ اخباروں کی فائلوں میں ان کو ڈھونڈ کر پڑھنا، ذہنوں کو کھولتا اور روحوں کو بالیدگی فراہم کرتا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کے اداریے مرتب کر کے کتابی شکل میں بھی چھاپے گئے۔ لاہور کے احمد سعید مرحوم نے 'زمیندار' کے اداریے' مقالہ ہائے افتتاحیہ اور شذرات' کے عنوان سے مرتب کر کے مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ سے شایع کروائے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اداریے بھی مختلف کتابوں میں محفوظ کیے جاتے رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد بھی مختلف ادوار کے سیاسی وسماجی رجحانات کے تنقیدی جائزوں کے لیے اداریوں سے مدد لی جاتی رہی ہے۔ اہل علم کے ذوق اور طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر بہت سے اداریے کتابی صورت میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ 'پاکستان ٹائمز' کے لیے مظہر علی خان کے لکھے گئے اداریے 'The First Twelve Years: The Pakistan Times Editorials of Mazhar Ali Khan' کے عنوان سے ۱۹۹۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شایع کیے۔ ان اداریوں کو پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے استفادے کے بغیر آزادی کے بعد کے پہلے عشرے کے سیاسی بحرانوں، اقتصادی احوال اور ملک کے خارجہ تعلقات کے بارے میں کوئی معروضی رائے ہی قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس دور کے حوالے سے فیض احمد فیض اور سید سبط حسن کے اداریے بھی بڑی تاریخی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ یہ اداریے ہفت روزہ 'لیل و نہار' (لاہور) میں شایع ہوئے جو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا پرچہ تھا۔ میاں افتخار الدین کا یہ ادارہ انگریزی اخبار 'پاکستان ٹائمز' (ایڈیٹر: مظہر علی خان) اور اردو اخبار 'امروز' (ایڈیٹر: احمد ندیم قاسمی) اور ہفت روزہ 'لیل ونہار' (ایڈیٹر: سید سبط حسن) شایع کرتا تھا۔ ان تینوں مطبوعات کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے۔ رسالے کے اداریے بھی سبط حسن اور کبھی فیض لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب 'لیل ونہار' کراچی سے نکلا، تب بھی اس کے ایڈیٹر فیض اور سبط حسن تھے اور یہی دونوں اس کے اداریے لکھتے

تھے۔ ۱۹۹۳ء میں احمد سلیم صاحب اور راقم السطور نے سوچا کہ ان دونوں کے اداریوں کو مرتب کیا جائے۔ تب مسئلہ یہ تھا کہ یہ کیسے طے ہوتا کہ کون سا اداریہ فیض صاحب کا لکھا ہوا ہے اور کون سا سبط حسن صاحب کا۔ اس سلسلے میں دو سینیئر صحافی بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ کراچی میں حسن عابدی صاحب نے ان سب اداریوں کے فوٹو اسٹیٹس پر نشاندہی کی کہ کون سا اداریہ کس کا لکھا ہوا تھا۔ عابدی صاحب دونوں ادوار میں خواہ وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک کا 'لیل و نہار' تھا یا ۱۹۷۰ء کے دور کا، وہ ان دونوں ادوار میں رسالے کے ادارتی عملے میں شامل تھے، وہ بہت سنجیدہ اور گہرے علمی و ادبی ذوق کے حامل صحافی تھے۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ کون سا اداریہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد عابدی صاحب کی نشاندہی کی توثیق کی خاطر احمد سلیم صاحب نے فوٹو اسٹیٹ کا ایک اور سیٹ ظہیر بابر صاحب کے سامنے رکھا۔ وہ بھی دونوں ادوار میں 'لیل و نہار' میں باقاعدگی کے ساتھ لکھتے تھے اور لاہور کے دورِ اشاعت میں تو وہ ادارے کا حصہ بھی تھے۔ جب دونوں کے نشاندہی کردہ اداریوں میں یہ دیکھ لیا گیا کہ ان دونوں نے کن کن اداریوں کو کس اداریہ نویس کا لکھا ہوا قرار دیا ہے تب پھر فیصلہ کرنا آسان تھا کہ فیض صاحب کے اور سبط صاحب کے اداریے الگ الگ مرتب کر لیے جائیں۔ یوں فیض صاحب کے اداریوں کی کتاب 'موج زر' اور سبط صاحب کے اداریوں پر مشتمل کتاب 'روشن خیالی' معرض وجود میں آئیں۔ موخر الذکر بعد ازاں 'پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل' کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں بھی شایع ہوئی۔ ان کتابوں میں جو اداریے محفوظ ہوئے ہیں وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے انتہائی اہم حوالے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لا سے پہلے 'لیل و نہار' آنے والے طوفان کے کیسے سنجیدہ سگنل دے رہا تھا یا ۱۹۷۰ء کے 'لیل و نہار' نے مشرقی پاکستان میں اٹھتے ہوئے بحران کے بارے میں نہ صرف پہلے سے اشارے دے دیے تھے بلکہ عین بحران کے وقت بھی ملک کے اتحاد کے نقطۂ نظر سے صائب ترین خیالات اور تجزیے پیش کر دیے تھے۔

تاریخی اہمیت کے اداریے آئی ایچ برنی کے جریدے 'آؤٹ لک' میں بھی شایع ہوتے رہے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں نکلا اور بند ہوگیا اور پھر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ایک مرتبہ پھر نکلا، مگر اس مرتبہ بھی چند ہی برسوں میں ختم ہوگیا۔ آئی ایچ برنی کے اداریے 'Outlook: Selected Articles' کے عنوان سے ۲۰۱۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے کتابی شکل میں شایع کیے گئے۔

۱۹۷۰ء اور اس کے بعد کے چند برسوں میں دائیں بازو کے معروف جریدے 'اردو ڈائجسٹ' میں لکھے گئے الطاف حسن قریشی صاحب کے اداریے بھی 'نوکِ زبان' کے نام سے کتابی شکل میں چھپے۔

کتابی شکل میں ان اداریوں کی تدوین نہ صرف اداریہ نویسوں کی

مغربی پاکستان کے 16 اخبارات کا سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف مشترکہ اداریہ

ژرف نگاہی اور تیز فہمی پر دلالت کرتی ہے بلکہ ان کے ذریعے ہمیں کسی بھی دور کے بارے میں اس وقت کے رجحانات، سیاسی طلاطم کی نوعیت، بین الاقوامی تعلقات کی حرکیات اور ملکی و عالمی اقتصادی حالات کے بارے میں ایسا مواد میسر آ جاتا ہے جو اس عہد کے بارے میں ہمیں ایک تاریخی آگاہی فراہم کر دیتا ہے۔

اداریے نہ صرف اپنے عہد کی عکاسی کرتے رہے ہیں بلکہ خود صحافت جن حالات سے دوچار رہی ہے ان کا ادراک بھی ہمیں ان کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ریاستوں میں جہاں آزادیٔ صحافت میسر نہ ہو وہاں اخبار یا تو سرکاری ہدایات اور سرکار کے متعین کردہ دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے اپنا کام کرتے ہیں یا پھر وہ آزادیٔ اظہار کے جویا ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری تعزیروں کی زد میں بھی آتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ ایسی لامحدود مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں اخبارات میں یا تو حکومتوں کی فرمانبرداری اور یہاں تک کہ کاسہ لیسی تک کا رویہ اختیار کیا گیا یا پھر مزاحمت کی راہ اپنائی گئی۔ بے شمار کتابیں ان موضوعات پر چھپ چکی ہیں جن میں ہر دو طرح کے رجحانات کی وافر مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حکومتوں کی مزاحمت کرنے والے اخبار نویس سیکڑوں کی تعداد میں موجود رہے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے اداریے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ہماری تاریخ کا ایک اہم اثاثہ ہیں۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ' کے خلاف سولہ اخبارات کا بیان

یہی نہیں بلکہ حکومت کے جبر کے نتیجے میں جن اخباروں نے فرمانبرداری کا رویہ اختیار کیا انہوں نے بھی بعض مواقع پر ایسے اداریے لکھے جو آزادیٔ صحافت کے دامن پر ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ وہ ہے جب قیام پاکستان کے چند ماہ بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں اس وقت کے معروف اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' پر حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ اخبار نے نئی دہلی میں اپنے رپورٹر کے حوالے سے یہ خبر شایع کی کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں جموں و کشمیر کی ریاست کی تقسیم کے کسی سمجھوتے پر کام کر رہی ہیں۔ حکومت نے اس خبر کی تردید کی۔ اخبار نے بھی اس تردید کو پہلے صفحے پر شایع کیا اور اپنی طرف سے معذرت بھی کی کہ اس نے بغیر تصدیق کے اس خبر کو شایع کر دیا تھا لیکن اخبار کی یہ معذرت کافی نہیں سمجھی گئی۔ 'نوائے وقت' کی قیادت میں ایک مہم چلی جس کے نتیجے میں یہ افسوسناک واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ مغربی پاکستان کے کم از کم سولہ روزناموں نے گزٹ کے خلاف ایک مجموعی اداریہ شایع کیا۔ اس اداریے کو کسی مشرقی پاکستانی اخبار نے شایع نہیں کیا اداریے میں کہا گیا:

''پیشہ ورانہ بداطواری سے قطع نظر، مذکورہ اخبار نے، ہماری سوچی سمجھی رائے میں، ہماری ریاست سے غداری کے عمل کا ارتکاب کیا ہے۔۔۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ گورنر مغربی پنجاب۔۔۔ کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے خلاف فوری طور پر تعزیری اقدام کرنا چاہیے اور ایک مناسب عرصے کے لیے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دینی چاہیے۔ اگر گورنر یہ کارروائی کرنے سے قاصر رہے، تو ہم مرکزی حکومت سے مداخلت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے پاس ایسا کرنے کے لیے اختیارات موجود ہیں''۔

مشترکہ اداریے کو جن اخباروں نے شایع کیا ان میں کئی سرکردہ ایڈیٹروں کے اخبار شامل تھے۔ ان میں فیض احمد فیض کے نام پر آج تک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ان جیسا ترقی پسند اور روشن خیال ایڈیٹر جس نے بعد کے برسوں میں بڑی سزائیں بھی کاٹیں، کس طرح اس مہم کا حصہ بن گیا۔ مشترکہ اداریہ چھاپنے والے اخبارات یہ تھے:

کراچی کے روزنامے: ۱۔ 'ڈان' (الطاف حسین)، ۲۔ 'ڈان گجراتی' (نور محمد جمال نور میمن)، ۳۔ 'ڈان' اردو (فضل احمد صدیقی)، ۴۔ 'جنگ' (میر خلیل الرحمن)، ۵۔ 'انجام' (عمر فاروقی)، ۶۔ 'سندھ آبزرور' (پیر علی محمد راشدی) اور ۷۔ 'الوحید' سندھی (عبدالغفور سیتائی)۔

لاہور کے روزنامے: ۸۔ 'پاکستان ٹائمز' (فیض احمد فیض)، ۹۔ 'نوائے وقت' (حمید نظامی)، ۱۰۔ 'امروز' (چراغ حسن حسرت)، ۱۱۔ 'زمیندار' (اختر علی خاں)، ۱۲۔ 'سفینہ' (وقار انبالوی)، ۱۳۔ 'انقلاب' (غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک)، ۱۴۔ 'غالب' (میر نور محمد)، ۱۵۔ 'مغربی پاکستان' (خلیل احمد) اور ۱۶۔ 'جدید نظام' (امین الدین صحرائی)۔

آزادیٔ رائے کی علمبرداری

آزادیٔ رائے کی پاسبانی کرتے ہوئے اور خود اس کو استعمال کرتے ہوئے سینکڑوں اداریہ نویسوں نے حکومت وقت کی پالیسیوں پر گرفت بھی کی۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ کچھ زیادہ مثالیں درج کی جائیں لیکن ایک آدھ مثال دی بھی جا سکتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کا المیہ رونما ہو چکا تھا، ذوالفقار علی بھٹو باقی ماندہ ملک کے صدر بن چکے تھے۔ چونکہ ان کو اقتدار ایک فوجی حکومت سے منتقل ہوا تھا لہٰذا وہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی قرار پائے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کئی اخبارات اور رسائل کے خلاف پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں۔ پابندیوں کی زد میں آنے والے الطاف گوہر بھی تھے جو

ادار یہ کیوں بند کیا جا رہا ہے

ایوب خان کے زمانے میں فوجی آمر کی ناک کا بال بنے رہے تھے مگر اب دور بدلا تو وہ نہ صرف آزادیٔ رائے کے علمبردار بن گئے جو بہر حال ان کا حق بھی تھا۔ بھٹو حکومت نے ان کے خلاف کاروائی بھی کی اور ان پر مارشل لا حکومت کے تحت مقدمہ چلا کر ان کو بند کر دیا گیا۔ اس سے پہلے وہ ڈان اخبار کے ایڈیٹر بن چکے تھے اور اس حیثیت میں انہوں نے اپنی بہترین انگریزی کا سکہ جماتے ہوئے بڑے تیز طرار اداریے لکھے۔ ایک اداریہ بڑا مشہور ہوا۔ بھٹو صاحب نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر وہ ہٹائے گئے تو پہاڑ بھی روئیں گے۔ اس بیان پر گرفت کرتے ہوئے الطاف گوہر نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا: 'Mountains don't cry'۔ یہ بڑا زوردار اداریہ تھا جس میں بھٹو حکومت کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ گوہر کے سب ہی اعتراضات درست نہیں تھے لیکن اداریہ بھرپور سیاسی اختلافِ رائے کا مظہر تھا۔

> **ایڈیٹر کا ادارہ غیر اہم۔ مالکان خود چیف ایڈیٹر بن گئے۔**

بعض ایسے ادوار میں جبکہ ملک میں سیاسی تقسیم نے گہرے تناؤ اور شدت پسندی کی شکل اختیار کی تو ایسے ادوار میں اس تقسیم کا حصہ بننے والے اخبارات کا لب ولہجہ بھی تیزی وطراری کا مظہر بنتا رہا جس کا اظہار ان کے اداریوں میں ہوتا تھا۔ آج ان اداریوں کو ماضی کی اُس سیاسی تقسیم کی نوعیت کے مطالعے کے لیے اچھے ماخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بھٹو صاحب ہی کے زمانے میں جہاں ایک طرف حکومت اور اس کے وزراء مخالفین پر لفظی بمباری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے وہیں مخالف اخبارات کا لب ولہجہ بھی سخت سے سخت تر نظر آتا تھا۔ وزیر اطلاعات ونشریات مولانا کوثر نیازی جنہوں نے ایک زمانے میں جبکہ وہ 'شہاب' کے ایڈیٹر تھے، مخالفین کی تحقیر اور تذلیل کے لیے کالم کے کالم سیاہ کیے تھے، برسر اقتدار آنے کے بعد 'چٹان' کے ایڈیٹر شورش کاشمیری کے بارے میں ایک جلسے میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ دونوں شخصیات کی رقابت بڑی دیرینہ تھی۔ ایک موقع پر تو وہ لاہور میں سربازار ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے بھی دیکھے گئے تھے۔ اب جو وزیر اطلاعات نے شورش کاشمیری کے بارے میں بدزبانی کا مظاہرہ کیا تو شورش نے بھی ان کو جواب دینا ضروری سمجھا۔ ان کا یہ جواب 'چٹان' کے اداریے کے طور پر شایع ہوا۔ انتہائی غلیظ باتوں سے بھرپور اس اداریے کا عنوان تھا: 'ابے اوئے کوثر نیازی، یہ ہے تیرا جواب'۔ اس طرح کے اداریے خود صحافت کے، سیاسی تقسیم کا حصہ بن جانے اور پھر اس تقسیم کو مزید شدید بنانے کی کوشش کا مظہر قرار دیے جا سکتے ہیں۔

اخباری صحافت کا زوال

ماضی میں اداریے اپنا جو جواز رکھتے تھے اور بحیثیت مجموعی انہوں نے اپنا جو منصبی کردار ادا کیا یا بعض صورتوں میں یہ سیاسی آویزشوں کا حصہ بن کر اپنے حقیقی کردار سے دور بھی ہوتے رہے، اس سب کا دور اب ایسا نظر آتا ہے کہ ختم ہو رہا ہے لیکن یہ واقعہ اخباری صحافت کی مجموعی صورت حال کے حصے کے طور پر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعی صورت حال اس تاریخی ادارے کے زوال کی مظہر ہے۔ اور یہ زوال دراصل صحافت کے صنعت بن جانے کا منطقی نتیجہ ہے۔ صنعتیں مالی منفعتوں کے حصول کے لیے ہی قائم کی جاتی ہیں۔ ان کا ارتقا بھی ارتکازِ سرمایہ اور سرمائے کی اجارہ داری کے اصولوں پر ہوتا ہے۔ صحافت جب صنعت بنی تو صنعت نے پہلے ہی دن اس پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں کر لیا بلکہ یہ کنٹرول اس کو رفتہ رفتہ حاصل ہوا۔ صحافت کی بہت سی روایتیں اور پیشہ ورانہ طریقہ ہائے کار ویسے ویسے ختم ہوتے چلے گئے جیسے جیسے کارپوریٹ کنٹرول نے اس کا تقاضہ کیا۔ پہلے اخبارات نے کمپنیوں کا تشخص حاصل کیا، پھر کمپنیوں کے ڈھانچے اپنائے، نئے عہدے تشکیل دیے۔ ایک مرحلے پر معلوم ہوا کہ مدیر اور ادارتی عملہ اب ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جبکہ شعبۂ اشتہارات اب زیادہ اہم بن چکا ہے۔ اشتہارات لانے والے طے کرنے لگے کہ کس خبر کو کس جگہ لگایا جائے۔ پھر کالم نگار اشتہار لانے پر مامور ہونے لگے، ان کے مشاہرے، اخبار کے لیے اشتہار لانے کی ان کی اہلیت سے مشروط ہونے لگے۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ ایڈیٹر کا ادارہ ہی غیر اہم بن چکا ہے۔ پھر مالکان خود ہی ایڈیٹر بھی بننے لگے۔ اخبار کی لوح پر ان کا نام مالک اور ایڈیٹر دونوں حیثیت میں چھپنے لگا۔

> **اخبارات کو استعماری حکومتیں ختم نہ کر سکیں۔ لیکن کارپوریٹ مفادات کی بھینٹ چڑھ گئے**

خبروں اور اداریوں سے پہلے ایڈیٹر کو دیوار سے لگایا گیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو ایک اور بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ پاکستان میں اکیسویں صدی کے آغاز پر پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا آغاز ہوا۔ اخباری صنعت کے مالکان نے فوراً ہی اس طرف توجہ مبذول کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چینلوں کا دور دورہ ہو گیا۔ اب اخبارات کے اشتہارات اہم نہیں رہے۔ چینلوں پر ان کی افادیت بھی زیادہ محسوس کی گئی۔ منافع بھی چینلوں ہی کے ذریعے زیادہ حاصل ہو سکتا تھا۔ سو، اخبارات کے صفحے کم ہونا شروع ہوئے۔ سب اخبارات نے ایک ایک کر کے اپنے میگزین بند کرنے شروع کیے۔ 'ڈان' کا 'بکس اینڈ آتھرز' کئی سال جاری رکھنے کے بعد بند کر دیا گیا۔ 'ٹیوسڈے ریویو' ختم کیا گیا، 'گیلری' قصہ پارینہ بنا۔ اب بمشکل ایک آدھ میگزین ہفتے میں چھاپ دیا جاتا ہے۔ 'جنگ' نے 'مڈویک میگزین' ختم کیا، 'ایکسپریس' نے سنڈے میگزین کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ملک کے کم وبیش سب ہی اخباروں نے اپنے دامن سکیڑنے شروع کر دیے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جو چند صفحے اخبار کے نام سے چھپ کر آتے ہیں وہ دس بارہ منٹ سے زیادہ کا مطالعہ ثابت نہیں ہوتے۔ یہ کارپوریٹ سیکٹر کی ایک سمٹتی ہوئی صنعت ہے جس کے جلو میں صحافت اپنا آخری دم لیتی نظر آتی ہے۔ اداریہ اسی روبہ زوال صحافت کا وہ حصہ ہے جو کبھی صحافت کا فخر ہوتا تھا۔ اب صحافت ہی زوال آمادہ ہے تو اداریہ کہاں بچ سکے گا اور کیوں بچ سکے گا۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ بعض صنعتیں اپنے صحافتی پیرائے کو باقی بھی رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کی ضرورت ہے کہ یہ صحافت کو نئے رنگ روپ میں اور نئی خصوصیات کے ساتھ بازار میں لائیں تاکہ وہ قارئین جو سوشل میڈیا کے اس دور میں بھی اس نئی طرز کی صحافت کے خریدار بن سکتے ہوں ان کے لیے اس کو دستیاب رکھ سکیں۔ 'نیویارک ٹائمز' نے اس کے لیے ایک بڑا پرازمعنی تجربہ کیا ہے۔ اداریہ تو اس نے ختم کر دیا لیکن خبروں کے صفحات میں تحقیق کے عنصر کو بڑے محسوس انداز میں داخل کر دیا ہے۔ اس میں ایک روز سینکڑوں خبروں کی بھرمار نہیں کی جاتی بلکہ چند خبروں پر تحقیقی رپورٹنگ کی جاتی ہے۔ ایسا کرتے وقت اس بات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی کہ تحقیقی رپورٹ اصل واقعہ سے دو یا تین دن بعد شایع ہو رہی ہے۔ مثلاً پچھلے کچھ عرصے ہی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس اخبار کے صفحوں میں بنگلہ دیش میں حسینہ واجد کی حکومت کے خاتمے کے گرد جن ہنگاموں کا زور رہا وہ فوری طور پر اخبار میں جگہ پانے کے بجائے دو ایک روز میں تحقیقی رپورٹوں کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کیے گئے۔ ایسا ہی حال میں نیپال میں ہونے والے پرتشدد واقعات کی اخبار میں پیشکش کے حوالے سے ہوا۔

سو، اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اداریے تو اب شاید دوبارہ واپس نہ آسکیں، اور جو رہ گئے ہیں وہ بھی تحقیقی اور گہرے تجزیوں ہی کی صورت میں باقی رہ سکیں گے۔ البتہ اخبارات یا معدوم ہو جائیں گے یا تو تحقیقی رپورٹوں کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ سب کچھ مالکان اخبارات کی مرضی ومنشا سے ہوگا۔ اخبارات جنہیں استعماری حکومتیں ختم نہیں کر سکیں، صحافت جس نے فوجی آمریتوں سے لڑ کر خود کو بچایا، وہ صحافت اب مالکان اخبارات اور ان کے کارپوریٹ مفادات کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔ ❁

دنیا میں اُردو کے سب سے بڑے اخبار''جنگ'' نے 8 ستمبر کو جب اخبار اداریے کے بغیر شائع کیا تو پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے علمی اور جمہوری حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ماہنامہ اطراف نے فوراً اکتوبر کا شمارہ اس صحافتی سانحے سے منسوب کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے سنیئر کالم نویس۔ برجستہ کے ایڈیٹر جناب غلام حیدر شیخ سے ایک مبسوط مضمون عنایت کرنے کی درخواست کی ہم شکر گزار ہیں کہ انھوں نے وقت نکالا اور اداریہ نویسی کے موضوع پر نہ صرف تاریخ پر تحقیق کی بلکہ اداریہ نویسی جمہوری جدوجہد، آزادی کی تحریکوں اور ایک محکم مضبوط معاشرے کی تعمیر میں اداریے کے کردار کی مختلف جہات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

اداریے کے خاتمے کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے

انتہائی سنیئر جہاندیدہ ایڈیٹر: غلام حیدر شیخ کی خصوصی تحریر

اخبارات میں ''اداریہ'' (Editorial) ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف ایک مضمون نہیں بلکہ اخبار کا اجتماعی شعور، موقف، اور پالیسی ہوتا ہے، جو قارئین کو رہنمائی فراہم کرتا ہے حکومت اور اداروں کے لیے اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

دنیا بھر میں اخبارات کے ''اداریے'' معاشرتی تبدیلی، سیاسی شعور، اور قومی اصلاح کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئے ہیں۔ ایڈیٹوریل وہ کالم نہیں جو کسی فردِ واحد کی رائے ہو، بلکہ یہ ''ادارے'' کے اجتماعی نقطہ نظر کا عکاس ہوتا ہے، اسی لیے اسے غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔

برصغیر کی صحافتی تاریخ میں ''اداریے'' نے عوامی بیداری میں بنیادی کردار ادا کیا۔ برطانوی استعمار کے دور میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، حسرت موہانی، سرسید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد، سید عبید اللہ ہارون، حبیب الرحمن شروانی اور بعد ازاں چراغ حسن حسرت جیسے صحافیوں نے اپنے ''اداریوں'' کے ذریعے آزادی کی تحریک کو جلا بخشی۔ ان کے لکھے ہوئے الفاظ نے لاکھوں عوام کے دلوں میں ولولہ پیدا کیا اور آزادی کے خواب کو حقیقت کا روپ دیا۔

یہ ''اداریے'' محض خبریں نہیں تھے، بلکہ قوم کے لیے راستہ متعین کرنے والے منشور تھے۔ مثال کے طور پر مولانا ظفر علی خان کا اخبار زمیندار آزادی کی تحریک کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ''اداریے'' انگریز حکومت کے خلاف سیاسی شعور اور بغاوت کی علامت بن گئے۔ اس زمانے میں اخبارات پر انگریز حکومت کی سخت پابندیاں تھیں،

قیام پاکستان کی جدوجہد کے دوران بھی ''اداریوں'' نے قائداعظم محمد علی جناح کے نظریات کو عوام تک پہنچایا۔ ڈان اور دیگر اخبارات کے ''اداریے'' برصغیر کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا ذریعہ بنے۔

یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد بھی اخبارات نے ''اداریوں'' کے ذریعے نئی ریاست کے مسائل کو اجاگر کیا اور حکومت کو پالیسی سازی کے لیے رہنمائی فراہم کی، بدقسمتی سے وقت کے ساتھ ساتھ کئی اخبارات نے ''اداریے'' کے معیار کو برقرار رکھنے میں کوتاہی کی، لیکن پھر بھی بڑے اخبارات جیسے روزنامہ جنگ، نوائے وقت، دی نیوز، ڈان، دی نیشن وغیرہ نے اپنے ''اداریوں'' کو اپنی شناخت کا حصہ بنایا۔ ان اداراتی صفحات نے قارئین کو نہ صرف موجودہ حالات سے باخبر رکھا بلکہ انہیں قومی و بین الاقوامی امور پر گہری بصیرت بھی دی۔

برصغیر کی صحافت کا سنہری دور دراصل وہ زمانہ ہے جب اخبارات نے آزادی کی تحریک کے لیے نظریاتی قلعہ کا کردار ادا کیا۔ اس دور میں ''اداریہ'' صرف خبر یا تجزیہ نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی دستاویز سمجھا جاتا تھا جو عوام کے جذبات کو جوش دلاتا اور انہیں عملی جدوجہد پر آمادہ کرتا تھا۔

1970 میں حیدرآباد اسٹیج ڈرامہ نگاری سے ابتداء کی۔ کئی سندھی ڈراموں کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا اور شہر کے لوکل اخبارات میں لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ جرأت کراچی میں مسلسل کالم نویسی کی۔ بعد ازاں روزنامہ پاکستان روزنامہ سرزمین روزنامہ جرآت لاہور میں کالم لکھتے رہے۔ اک عرصہ سے روزنامہ نوائے وقت میں ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ ہفتہ وار کالم اسپیکر مانچسٹر میں لکھ رہے ہیں اسی طرح انگریزی میں کالم لکھنے کی ابتداء پاکستان آبزرور اور میٹرو ٹائم سے کی۔ ہفتہ وار انگریزی کے کالم مسلسل پاکستان آبزرور میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہفت روزہ اخبار جہاں میں پہلے مکتوب کویت لکھنا شروع کیا بعد ازاں مسلسل فیچر لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح پنجابی کے روزنامہ بھلیکھا میں پنجاب کے صوفیاء کرام پر ہفتہ وار فیچر لکھ رہے ہیں۔ انگریزی کے تین اخبارات دی پرونس اسلام آباد ڈیلی ٹائمز پشاور اور دی بزنس لاہور اور فیصل آباد کے لئے انگلش میں روزانہ کی بنیاد پر اداریہ لکھ رہے ہیں۔

غلام حیدر شیخ کی دو کتابیں زیر طبع ہیں تیسری کتاب ترتیب وتدوین کے مراحل میں ہے۔

سنسر شپ نافذ تھی، مگر اس کے باوجود کچھ جری صحافیوں نے'' اداریے'' لکھ کر قوم کے اندر بیداری پیدا کی۔ ان کے قلم کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز اور مؤثر تھی۔ جن میں مولانا محمد علی جوہر ان عظیم

اداریے۔اکثر حکومتی فیصلے بدلوا دیتے تھے

صحافتی شخصیات میں سے ہیں جن کے ''اداریوں'' نے آزادی کی تحریک کو مہمیز بخشی۔ ان کا اخبار کامریڈ (Comrade) مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا، مولانا جوہر کے ''اداریے'' محض خبروں کا تجزیہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ مسلمانوں کو آزادی کی راہ دکھانے والے نظریاتی منشور ہوتے۔ ان کے تحریری اسلوب میں شعلہ بیانی، دلیل، اور علمیت کا امتزاج پایا جاتا تھا، انگریز حکومت کو مولانا جوہر کے ''اداریوں'' سے اتنی تشویش تھی کہ کامریڈ کو کئی بار بند کر دیا گیا، مگر ان کی تحریروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔

مولانا ظفر علی خان کا شمار برصغیر کے سب سے زیادہ مؤثر ''اداریہ'' لکھنے والے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا اخبار زمیندار کسانوں، مزدوروں اور عام مسلمانوں کی آواز بن گیا، ان کے'' اداریے'' انگریز حکومت کے لیے ایک چیلنج تھے۔ وہ کھلے الفاظ میں استعمار کی پالیسیوں کو بے نقاب کرتے اور مسلمانوں کو سیاسی جدوجہد کے لیے آمادہ کرتے، ان کا مشہور ''اداریہ'' جس میں انہوں نے کہا:

"ہم نہ جھکیں گے، نہ بکیں گے، نہ رکیں گے"

عوام کے دلوں میں ایک نعرہ بن کر گونجتا رہا اور تحریک آزادی کا استعارہ بن گیا، زمیندار کے ''اداریوں'' نے نہ صرف عوامی بیداری میں اضافہ کیا بلکہ برصغیر کی سیاسی قیادت کو ایک متحرک پلیٹ فارم بھی فراہم کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا '' ہفت روزہ الہلال '' آزادی کی جدوجہد میں ایک فکری ہتھیار تھا۔ ان کے'' اداریے '' بلند فکر، گہری بصیرت، اور شعلہ بیانی کا حسین امتزاج تھے، الہلال کے ذریعے مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ایک طرف انگریز سامراج کے خلاف بیدار کیا، اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کا پیغام دیا، ان کے ''اداریے'' نوجوان نسل کو ایک فکری راستہ فراہم کرتے، اور وہ انہیں محض سیاست نہیں بلکہ ایک وسیع تر نظریے سے جوڑتے، انگریز حکومت نے الہلال کو بھی کئی بار بند کیا، لیکن مولانا آزاد کے'' اداریوں'' نے ایک ایسا فکری سرمایہ تخلیق کیا جو آج بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے، آج اس فکری صحافت کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے۔

اس دور میں اخبارات کی رسائی محدود تھی، مگر ان کے ''اداریے'' قہوہ خانوں، جلسوں، اور مساجد میں بلند آواز سے پڑھے جاتے۔ لوگ گلی محلوں میں جمع ہو کر ان ''اداریوں'' کو سنتے اور اس پر گفتگو کرتے، یوں ایک اجتماعی شعور پیدا ہوتا، جو بعد میں آزادی کی تحریک کی بنیاد بنا۔

یہ ''اداریے ''عوام کے دلوں میں امید، ولولہ، اور قربانی کا جذبہ پیدا

کرتے، اور انگریز حکومت کی طاقت کو چیلنج کرنے کا حوصلہ دیتے۔

قیام پاکستان کے بعد اخبارات نے نئے ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو اجاگر کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا، جب پاکستان اپنے وجود کی بقا اور اداروں کی تعمیر کے نازک مرحلے سے گزر رہا تھا، اس وقت اخبارات کے'' اداریے '' قوم کے لیے رہنمائی کا چراغ بنے۔

''ادارتی '' صفحات نے نہ صرف حکومت وقت کو اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کیا بلکہ عوام کو بھی شعور اور آگاہی فراہم کی، پاکستان کے ابتدائی دور میں صحافت ایک قومی مشن تھی، اور اس کے نمایاں کردار ادا کرنے والے ایڈیٹوریل نگار تاریخ کا لازوال حصہ ہیں جن میں

فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حمید نظامی، اور روزنامہ جنگ کے بانی میر خلیل الرحمٰن نے پاکستان کی صحافت میں ایک نیا باب رقم کیا، ان کے دور میں جنگ کے ''اداریے'' اعتدال، بصیرت اور عوامی امنگوں کے ترجمان ہوتے تھے، قیام پاکستان کے بعد جب ملک مختلف بحرانوں سے دوچار تھا، جنگ کے اداریوں نے عوام کو اتحاد اور حوصلہ دیا۔

ان کے ''اداریے'' محض خبروں کا تجزیہ نہیں تھے، بلکہ حکومت کے لیے اصلاحی نوٹ اور عوام کے لیے رہنمائی کے اصول فراہم کرتے تھے۔

پاکستان کے ابتدائی سیاسی بحرانوں، جیسے ون یونٹ کا قیام، مشرقی پاکستان کے مسائل، اور آئین سازی کے دوران جنگ کے'' اداریوں'' نے ایک معتدل مگر جرات مندانہ کردار ادا کیا۔

انگریزی روزنامہ ڈان نے قیام پاکستان کے فوراً بعد بین الاقوامی معیار کے''اداریوں'' سے ایک خاص پہچان بنائی، ایڈیٹوریل بورڈ کے سربراہ ایچ کے بُررا اور ان کے ساتھیوں نے ایسے ''اداریے '' لکھے جو پاکستان کے وقار کو عالمی سطح پر اجاگر کرتے تھے، ڈان کے ''اداریوں'' نے خارجہ پالیسی، دفاعی امور اور آئینی معاملات پر متوازن اور سنجیدہ رائے پیش کی، ان کا انداز نہایت علمی، مدلل اور

فکری صحافت کا جنازہ
اداریہ ختم۔صحافت بے سمت

دور اندیشی پر مبنی تھا، جس سے ملک کے اعلیٰ پالیسی ساز بھی رہنمائی لیتے تھے۔

اگرچہ ''اداریہ'' ہمیشہ سنجیدہ موضوعات پر لکھا جاتا ہے، مگر مشتاق احمد یوسفی جیسے ادیبوں نے مزاحیہ اور ہلکے پھلکے انداز سے ''اداریہ نگاری'' کو ایک نیا رنگ دیا، وہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ساتھ وابستہ رہے اور ان کی تحریروں نے عوام کو مشکل حالات میں مسکراہٹ اور تفکر دونوں فراہم کیے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ'' اداریہ'' صرف

سیاسی بیانات کا نام نہیں بلکہ فکری تفریح کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، قیام پاکستان کے بعد ''اداریوں'' کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اکثر حکومتی فیصلے ان

''جنگ'' کے اداریے عوام کو اتحاد اور حوصلہ دیتے تھے

کے دباؤ پر بدلے گئے، جیسا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی حقوق کی بحالی کے لیے جنگ اور دیگر اخبارات کے ''اداریوں'' نے زبردست مہم چلائی، ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران کئی اخبارات کے ''اداریوں'' نے آمریت کے خلاف نرم مگر مؤثر مزاحمت کی۔

بھٹو دور میں آئینی ترامیم اور عوامی حکومت کے حوالے سے ''اداریوں'' نے عوامی رائے کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا، یہ ''اداریے'' نہ صرف عوامی شعور کے مظہر تھے بلکہ حکومت کے لیے ایک آئینہ بھی تھے، جو غلطیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کرتے تھے۔

روزنامہ جنگ پاکستان کا سب سے بڑا اور مقبول اردو اخبار ہے، جس نے 1940ء کی دہائی سے لے کر آج تک صحافت میں اپنی ایک نمایاں اور باوقار پہچان قائم کی ہے، اس اخبار کا ''ادارتی صفحہ'' ہمیشہ اس کی جان اور وقار سمجھا جاتا رہا ہے، کیونکہ یہاں قوم کے بڑے مسائل پر مدلل اور غیر جانبدار تجزیہ پیش کیا جاتا تھا، لیکن حالیہ دنوں میں جنگ کی انتظامیہ نے اچانک ''اداریہ'' لکھنے کا سلسلہ بند کر دیا، جو صحافتی حلقوں میں گہری تشویش اور بحث کا سبب بن گیا ہے، یہ فیصلہ صرف ایک اخبار کے ''اداریہ'' کو ختم کرنے کا معاملہ نہیں، بلکہ اسے صحافت کے مستقبل پر ایک خطرے کی گھنٹی کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

اخبارات کے ''اداریے'' کسی بھی معاشرے میں اجتماعی ضمیر کا کردار ادا کرتے ہیں، یہ حکومت وقت کی پالیسیوں پر نگران کی حیثیت رکھتے ہیں اور عوام کو سمت اور شعور فراہم کرتے ہیں، جب سب سے بڑے اور معتبر اخبار کا ''اداریہ'' ہی ختم کر دیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فیصلہ محض انتظامی وجوہات کے تحت کیا گیا ہے یا اس کے پیچھے کوئی سیاسی دباؤ اور قدغن موجود ہے؟

کئی صحافتی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ قدم آزادیء صحافت کے لیے ایک منفی علامت ہوسکتا ہے، کیونکہ ''اداریہ'' حکومت اور عوام کے درمیان ایک ایسا پل ہے جو اب ٹوٹنے کے خطرے سے دوچار ہے۔ لہٰذا ''اداریہ'' کے خاتمے کے کئی گہرے اثرات مرتب ہوں گے، عوام کو کسی بھی اہم مسئلے پر اخبار کی مربوط رائے میسر نہیں ہو سکے گی، جس سے خبر اور تجزیہ کا فرق مٹنے لگے گا، حکومت وقت پر اخلاقی دباؤ کم ہو جائے گا، کیونکہ ''اداریے'' اکثر پالیسی سازی میں تنقید اور رہنمائی کا کردار ادا کرتے ہیں، اخبارات کے قارئین کے لیے یہ قدم مایوسی کا سبب بنے گا، کیونکہ ''ایڈیٹوریل'' وہ واحد جگہ تھی جہاں خبروں کے پس منظر اور گہرائی کو پیش کیا جاتا تھا، نوجوان صحافیوں کے لیے یہ فیصلہ تربیت کے مواقع محدود کرے گا، کیونکہ ''اداریہ نگاری'' ہمیشہ صحافت کی اعلیٰ تربیت گاہ سمجھی جاتی ہے۔

جیسے ہی یہ خبر سامنے آئی، مجھے شدید تشویش ہوئی کہ یہ قدم صرف ایک اخبار کا داخلی معاملہ نہیں بلکہ ملک بھر میں صحافت کو محدود کرنے کی ایک وسیع تر پالیسی کا حصہ ہوسکتا ہے، میرے خیال میں اگر یہ سلسلہ دیگر اخبارات تک پھیل گیا تو ''اداریہ نگاری'' کا کلچر ختم ہو جائے گا۔

جس کا نتیجہ ایک خاموش صحافت کی شکل میں نکل سکتا ہے، جہاں صرف خبریں تو ہوں گی مگر ان پر کوئی اصلاحی یا تنقیدی آواز موجود نہیں ہوگی۔

تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں ''اداریوں'' نے عوام کو سیاسی شعور دیا، آزادی کی تحریک کو تقویت بخشی اور حکومتوں کی اصلاح کی، سر سید احمد خان، مولانا ظفر علی خان، حمید نظامی، میر خلیل الرحمٰن، مجید نظامی اور دیگر ادبی وصحافتی شخصیات نے ''اداریوں'' کے ذریعے قوم کی سمت متعین کی، آج اگر ''اداریہ'' ختم ہو جائے تو یہ تاریخ کے اس تسلسل کو توڑنے کے مترادف ہوگا، میرا یہ خدشہ بڑھ رہا ہے کہ کہیں یہ اقدام صحافت کو دفن کرنے کی تیاری تو نہیں، کیونکہ ایک ایسا معاشرہ جہاں اختلافی رائے کو جگہ نہ ملے، وہاں جمہوریت محض ایک نعرہ بن کر رہ جاتی ہے۔

روزنامہ جنگ کو چاہیے کہ وہ اس فیصلے پر نظر ثانی کرے اور اپنے قارئین کو اس بارے میں وضاحت فراہم کرے، اسی طرح صحافتی تنظیموں کو بھی اپنا مؤثر کردار ادا کرنا ہوگا تاکہ ''اداریہ نگاری'' جیسے قیمتی ورثے کو محفوظ رکھا جا سکے، ''اداریہ'' کا خاتمہ محض ایک ادارتی تبدیلی نہیں بلکہ قومی صحافت کے وجود کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے، اگر آج اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی تو کل اخبارات صرف خبری بلیٹن بن کر رہ جائیں گے، اور وہ فکری و اصلاحی کردار ہمیشہ کے لیے ماضی کا قصہ بن جائے گا۔

''اداریہ'' اخبار کا وہ حصہ ہے جہاں اخبار صرف خبریں دینے والا پلیٹ فارم نہیں رہتا بلکہ قوم کی رہنمائی، اصلاح اور احتساب کا کردار ادا کرتا ہے، روزنامہ جنگ کے ''اداریہ'' ختم کرنے کے فیصلے نے جہاں مایوسی کو جنم دیا ہے، وہیں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ پاکستان میں ''اداریہ'' نگاری کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگر اس پر فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ روایت رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی اور صحافت محض کاروباری خبر رسائی تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

ڈیجیٹل میڈیا کے پھیلاؤ نے اخبارات کے قارئین کو آن لائن پلیٹ فارمز کی طرف موڑ دیا ہے، جس کی وجہ سے کئی اخبارات نے اپنی توجہ صرف خبری رفتار بڑھانے پر مرکوز کر دی ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ڈیجیٹل میڈیا خبروں کو تو فوراً پھیلا سکتا ہے مگر مدلل اور گہرے تجزیے کا خلا کبھی نہیں بھر سکتا، ''اداریہ'' ہی وہ ذریعہ ہے جو

مولانا محمد علی جوہر کے اداریوں نے تحریکِ آزادی کو مہمیز بخشی

خبر کے پس منظر کو سمجھنے، اس کے مضمرات کا جائزہ لینے اور پالیسی سطح پر اصلاح تجویز کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اگر ''اداریہ'' کو ختم کر دیا گیا، تو عوام کو محض سطحی خبریں ملیں گی، جبکہ سوچ اور فہم کی گہرائی ختم ہو جائے گی، حکومت کو چاہیے کہ اخبارات کے ''ادارتی''

صفحات کو قانونی حیثیت دے تاکہ کوئی ادارہ محض انتظامی یا سیاسی دباؤ کے تحت انہیں ختم نہ کر سکے، اس کے لیے ایک میڈیا پالیسی تشکیل دی جاسکتی ہے جس میں ''اداریہ'' کو صحافت کا بنیادی جز قرار دیا جائے، پاکستان میں ''اداریہ'' لکھنے کے ماہر صحافیوں کی تعداد محدود ہو رہی ہے۔

بھارت میں آج بھی بڑے اخبارات جیسے دی ہندو، انڈین ایکسپریس روزانہ مضبوط ''اداریہ'' لکھتے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں پر تنقید اور عوامی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، امریکا اور برطانیہ جیسے ممالک میں بھی ایڈیٹوریل بورڈز نہ صرف اخبارات کا وقار بڑھاتے ہیں بلکہ جمہوریت کے نگہبان کے طور پر کام کرتے ہیں، پاکستان میں اس روایت کو ختم کرنا گویا اپنے ہی فکری دفاع کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔

''اداریہ'' محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ قوم کی اجتماعی دانش ہے، یہ وہ

آئینہ ہے جو حکومت کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے اور عوام کو ان کے حقوق کا شعور دیتا ہے، اگر اخبارات ''اداریہ'' ختم کرنے لگیں تو یہ صرف صحافت کا نقصان نہیں بلکہ جمہوریت اور معاشرتی ترقی کا زوال ہوگا، کیونکہ اگر آج ''اداریہ'' کا چراغ بجھ گیا تو کل صحافت کی روشنی ہمیشہ کے لیے مدھم ہوجائے گی۔

مولانا ظفر علی خان کے اداریے، تحریکِ پاکستان کا استعارہ بن گئے

پاکستان اور برصغیر کی صحافت کی تاریخ میں ''اداریہ نگاری'' نے ہمیشہ ایک تاریخی اور انقلابی کردار ادا کیا ہے، ''اداریہ'' محض کسی اخبار کا رائے دینے والا کالم نہیں بلکہ یہ قوم کے اجتماعی شعور کو جگانے والا ذریعہ رہا ہے، تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں اخبارات کے ''اداریہ جات'' نے نہ صرف سیاسی تحریکوں کو جلا بخشی بلکہ عوام کے ذہنوں کو بھی بیداری اور جدوجہد کے لیے تیار کیا۔

برصغیر کے اخبارات میں ''اداریہ'' کی روایت اُنیسویں صدی کے وسط میں پروان چڑھی، سرسید احمد خان کا رسالہ تہذیب الاخلاق، مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ اور مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار وہ پلیٹ فارمز تھے جنہوں نے ''اداریوں'' کے ذریعے عوام میں سیاسی اور

اداریے، مسجدوں، قہوہ خانوں، جلسوں محلوں میں جمع ہوکر سنے جاتے تھے

سماجی شعور پیدا کیا، مولانا محمد علی جوہر کے ''اداریے'' برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کا استعارہ بن گئے، جبکہ مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کے ذریعے عوام کو تحریکِ آزادی کے لیے متحد اور منظم کیا، ان ''اداریوں'' نے انگریزوں کو پریشان کر دیا تھا اور کئی بار ان اخبارات پر پابندیاں لگائی گئیں، لیکن یہ ''اداریہ'' نگاری کی طاقت تھی کہ ان کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دیتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اخبارات نے ریاست سازی اور قومی مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا، روزنامہ جنگ، نوائے وقت، امروز اور دیگر اخبارات کے ''اداریہ'' جات عوام کو قومی پالیسیوں سے باخبر رکھنے اور حکومت وقت کو اصلاحی تجاویز دینے کا ذریعہ بنے۔

میر خلیل الرحمٰن کے روزنامہ جنگ کے ''اداریے'' اپنی اعتدال پسندی اور حقائق پر مبنی تجزیے کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے تھے۔

اسی طرح حمید نظامی کے اخبار نوائے وقت نے مجید نظامی کی ادارت میں اپنے ''اداریوں'' کے ذریعے نظریہ پاکستان اور قومی سلامتی کے مسائل پر واضح موقف اختیار کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ''اداریہ'' جات نے عوام کو جمہوریت کے حق میں آواز بلند کرنے پر آمادہ کیا، جبکہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے دور میں یہ ''اداریے'' آزادیٔ صحافت کی جنگ کا ہتھیار بنے، اس وقت کئی صحافیوں کو پابندیوں اور جیلوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر انہوں نے قلم کا پرچم بلند رکھا۔

''اداریہ'' کی طاقت کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ یہ عوامی رائے کو تشکیل دیتا ہے، ایک مضبوط اور مدلل اداریہ عوام کو نہ صرف مسائل کی وجوہات سمجھاتا ہے بلکہ ان کے حل کے لیے سوچنے اور عمل کرنے پر بھی آمادہ کرتا ہے، مثال کے طور پر، 1965 کی جنگ کے دوران جنگ اور نوائے وقت کے ''اداریوں'' نے عوام کے حوصلے بلند کیے اور قومی اتحاد کو فروغ دیا، اسی طرح 2007 کی وکلاء تحریک کے دوران اخبارات کے ''اداریہ'' جات نے عوامی مزاحمت کو تقویت دی اور عدلیہ کی بحالی کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔

بھارت میں آج بھی بڑے اخبارات جیسے دی ہندو، انڈین ایکسپریس، اداریہ نگاری کو اپنی صحافت کا مرکزی ستون مانتے ہیں۔ان اخبارات کے اداریے اکثر حکومتی پالیسیوں پر کھلی تنقید کرتے ہیں، جس سے حکومتوں کو اپنی حکمتِ عملی پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، بھارت کے صحافیوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ''اداریہ'' محض اخبار کا حصہ نہیں بلکہ جمہوریت کے دفاع کا ایک مضبوط ہتھیار ہے۔

پاکستان میں اس روایت کا ختم ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ ہم اپنی فکری طاقت کو خود اپنے ہاتھوں کمزور کر رہے ہیں۔

ماضی کے ان عظیم اداریہ جات سے سبق ملتا ہے کہ یہ صرف الفاظ نہیں بلکہ عملی جدوجہد کا حصہ ہوتے ہیں، اگر ہم ''اداریہ'' نگاری کو نظرانداز کریں گے تو عوام کو وہ فکری رہنمائی نہیں ملے گی، جو کسی جمہوری

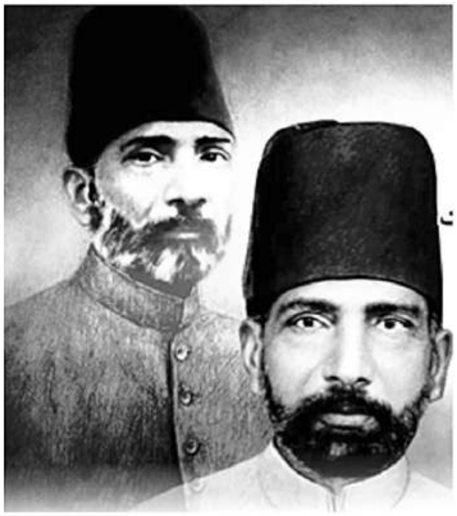

معاشرے کے لیے ضروری ہے، اخبارات کو چاہیے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو سمجھیں اور ''اداریہ'' زندہ رکھنے کے لیے بھرپور اقدامات کریں، ورنہ وہ وقت دور نہیں جب ہماری صحافت محض خبری مشین بن کر رہ جائے گی، اور وہ تاریخ جو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے اپنے اداریوں سے رقم کی، ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گی۔

پاکستان میں ''اداریہ'' نگاری کے حالیہ بحران نے نہ صرف صحافتی حلقوں میں بلکہ فکری اور ادبی حلقوں میں بھی شدید تشویش پیدا کر دی ہے۔

روزنامہ جنگ جیسے بڑے اخبار کا ''اداریہ'' ختم کرنا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ اخباری ادارے یا تو مالی مسائل، سیاسی دباؤ یا ڈیجیٹل

دور کے تقاضوں کے آگے جھک رہے ہیں۔

پارلیمنٹ میں آواز بلند کی جائے، ایک پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی جائے

یہ صورتحال صرف ایک اخبار یا ایک ادارے کا مسئلہ نہیں، بلکہ

پورے میڈیا ایکوسسٹم کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے، یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جب دنیا کے بڑے اخبارات اور میڈیا گروپس ''اداریہ'' نگاری کو مزید مضبوط کر رہے ہیں، پاکستان میں اس روایت کو کمزور یا دفن کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کوئی اخبار حکومت پر تنقید کرتا ہے تو اسے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ''اداریہ'' چونکہ ادارے کی اجتماعی رائے ہوتی ہے، اس لیے حکومتیں اسے اپنے لیے براہِ راست چیلنج سمجھتی ہیں، نتیجتاً بعض اخبارات مجبوری کے تحت یا اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ''اداریہ'' نگاری کو محدود یا ختم کر دیتے ہیں۔

اخبارات کی آمدنی میں کمی، اشتہارات کے بجٹ کا سکڑنا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی بڑھتی ہوئی مسابقت اخباری اداروں کو صرف خبری مواد پر توجہ دینے پر مجبور کر رہی ہے، کیونکہ تجزیہ اور ''اداریہ'' کے لیے الگ وسائل درکار ہوتے ہیں، سوشل میڈیا اور آن لائن پلیٹ فارمز کی تیز رفتاری نے خبروں کے معیار کو متاثر کیا ہے، کئی اخبارات سمجھتے ہیں کہ لوگ اب طویل اداریے پڑھنے کے بجائے مختصر ویڈیوز یا پوسٹس کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کیونکہ دنیا کے بڑے ادارے ابھی بھی اپنے ''اداریہ'' کے قارئین کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہیں۔

دنیا کے کئی ممالک میں ''اداریہ'' نگاری آج بھی صحافت کا سب سے مضبوط ستون ہے۔

نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ جیسے بڑے اخبارات کے ایڈیٹوریل بورڈز نہ صرف روزانہ ''اداریہ'' شائع کرتے ہیں، بلکہ قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، ان اداروں کے ''اداریہ'' اکثر امریکی حکومت کو پالیسی میں تبدیلی پر مجبور کرتے ہیں، جیسا کہ ویتنام جنگ یا حالیہ افغانستان سے انخلا کے معاملات میں ہوا۔

دی گارڈین اور دی ٹائمز جیسے اخبارات نے ''اداریہ'' کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ساتھ جوڑ کر اسے نئی زندگی دی ہے، آج ان کے ایڈیٹوریل ہزاروں قارئین کے ساتھ ساتھ پالیسی ساز اداروں تک بھی پہنچتے ہیں۔

بھارتی اخبارات جیسے دی ہندو اور انڈین ایکسپریس آج بھی ''اداریہ'' کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں، یہ اخبارات حکومت کے سخت ناقد ہونے کے باوجود اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے ہیں، کیونکہ وہاں ''اداریہ'' کو جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ دنیا بھر میں ''اداریہ'' ختم کرنے کے بجائے جدید ٹیکنالوجی اور آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے اس کی رسائی کو بڑھایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں ''اداریہ'' کے موجودہ بحران سے نکلنے کے لیے درج ذیل اقدامات ضروری ہیں:

ڈیجیٹل تبدیلی کے لئے اخبارات کو چاہیے کہ وہ اپنے ''اداریہ'' کو آن لائن پلیٹ فارمز پر پرکشش انداز میں پیش کریں، یہ نہ صرف قارئین کی تعداد بڑھائے گا بلکہ عالمی سطح پر پاکستانی صحافت کی شناخت بھی قائم کرے گا، اداروں کو چاہیے کہ وہ اپنے ایڈیٹوریل بورڈز کو سیاسی دباؤ سے آزاد رکھیں اور انہیں ادارہ جاتی خودمختاری فراہم کریں، قارئین کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ''اداریہ'' صرف رائے نہیں بلکہ ان کے حقوق کی آواز ہے، اگر عوام اس مسئلے پر خاموش رہیں گے تو ''اداریہ'' کی موت یقینی ہو جائے گی، دنیا کے بڑے اخبارات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''اداریہ'' ڈیجیٹل دور میں بھی زندہ رہ سکتا ہے، بلکہ اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، پاکستان کے اخبارات کو چاہیے کہ وہ عالمی میڈیا سے سبق سیکھیں اور اپنی اس عظیم روایت کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالیں، اگر آج ہم نے ''اداریہ'' کے چراغ کو بجھنے دیا تو کل ہماری صحافت محض خبر رسانی تک محدود ہو جائے گی، اور وہ فکری گہرائی جو ماضی میں قوم کو سمت دیتی تھی، ہمیشہ کے لیے کھو جائے گی۔

پاکستان میں ''اداریہ'' نگاری کے زوال کا مسئلہ محض صحافت تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثرات براہِ راست جمہوری نظام، عوامی شعور اور قومی پالیسی سازی پر پڑتے ہیں، ''اداریہ'' ہمیشہ سے حکومت اور عوام کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا آیا ہے، جو حکومت کو اس کی غلطیوں کا احساس دلاتا ہے اور عوام کو ان کے مسائل کے حل کے لیے راستہ دکھاتا ہے، اگر اس پل کو توڑ دیا جائے تو یہ صرف اخبارات کا نقصان نہیں بلکہ پوری جمہوریت کے لیے زوال کی علامت ہوگا، روزنامہ جنگ جیسے سب سے بڑے اردو اخبار کے ''اداریہ'' کے خاتمے نے اس خطرے کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے تو اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔

''اداریہ'' وہ ذریعہ ہے جو عوام کو خبروں کے پس منظر اور حقائق سمجھاتا ہے، خبریں محض واقعات بیان کرتی ہیں، مگر ''اداریہ'' ان واقعات کو سیاق و سباق کے ساتھ پیش کرتا ہے تاکہ عوام اپنی رائے تشکیل دے سکیں، اگر ''اداریہ'' ختم کر دیے جائیں تو عوام کو صرف کچی اور سطحی خبریں ملیں گی، جس سے وہ مسائل کی اصل جڑ تک نہیں پہنچ پائیں گے اور ان کی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت متاثر ہوگی، یہ صورتحال حکمران طبقات کو زیادہ طاقتور بنا دے گی کیونکہ عوام کے پاس مربوط اور مدلل تنقید کا ذریعہ موجود نہیں ہوگا۔

''اداریہ'' ہمیشہ حکومت کے لیے ایک اخلاقی چیک اینڈ بیلنس فراہم کرتا رہا ہے، یہ وہ پلیٹ فارم ہے جہاں حکومتی پالیسیوں کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جاتا ہے اور اصلاحی تجاویز دی جاتی ہیں، اگر ''اداریہ'' کا کردار ختم کر دیا جائے تو حکومت کو تنقید سے بچنے کا محفوظ راستہ مل جائے گا، جس کے نتیجے میں بدعنوانی، اختیارات کے ناجائز استعمال اور عوامی وسائل کی بربادی میں اضافہ ہوگا، جمہوریت کی

روح اس وقت ہی باقی رہتی ہے جب حکومت کو مسلسل جواب دہ بنایا جائے، اور اس عمل میں ''اداریہ'' سب سے مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ ''اداریہ'' کا خاتمہ دراصل آزادیء صحافت کو کمزور کرنے کی ایک حکمت عملی بھی ہوسکتی ہے، جب کسی ملک میں وہ پلیٹ فارم ہی ختم کر دیا جائے جہاں سے حکومت کو اجتماعی رائے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی آوازوں کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ عمل آہستہ آہستہ صحافت کو محض خبری صنعت میں بدل دے گا، جہاں رپورٹرز تو موجود ہوں گے مگر فکری رہنمائی اور تنقید کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔

''اداریہ'' نہ صرف حکومت پر بلکہ دیگر جمہوری اداروں جیسے پارلیمنٹ، عدلیہ اور الیکشن کمیشن پر بھی اصلاحی دباؤ ڈالتا ہے، جب یہ دباؤ ختم ہوجائے گا تو یہ ادارے مزید غیر فعال ہوجائیں گے، مثال کے طور پر، ماضی میں جب انتخابی دھاندلی کے الزامات لگے تو اخبارات کے ''اداریوں'' نے عوامی بیداری پیدا کی اور انتخابی اصلاحات کے مطالبات کو تقویت دی، اگر اب ایسے ''اداریے'' موجود نہ رہے تو ان اداروں کو اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کے لیے کوئی اخلاقی دباؤ محسوس نہیں ہوگا۔

قارئین سوشل میڈیا پر مہم چلائیں، اخبارات کے دفاتر میں احتجاج جمع کروائیں

دنیا کے جمہوری ممالک میں صحافت کو چوتھا ستون مانا جاتا ہے، اور ''اداریہ'' کو اس ستون کا سب سے مضبوط حصہ سمجھا جاتا ہے، اگر پاکستان میں ''اداریہ'' نگاری ختم ہوگئی تو دنیا میں یہ تاثر جائے گا کہ پاکستان جمہوریت اور آزادیء اظہار کے حوالے سے پسپائی اختیار کر رہا ہے، یہ تاثر نہ صرف پاکستان کے صحافتی وقار کو متاثر کرے گا بلکہ عالمی سطح پر اس کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات پر بھی منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

''اداریہ'' نہ صرف موجودہ نسل کو رہنمائی فراہم کرتا ہے بلکہ نوجوان صحافیوں کے لیے یہ سیکھنے کا ایک عملی پلیٹ فارم ہوتا ہے، ''اداریہ'' نگاری کے ختم ہونے سے صحافیوں کی تربیت کا یہ اہم ذریعہ ختم ہو جائے گا، جس سے مستقبل میں ایسی نسل تیار نہیں ہو پائے گی جو گہرے تجزیے اور تحقیقی صحافت کی بنیاد رکھ سکے، نتیجتاً صحافت سطحی ہوجائے گی اور سنجیدہ فکری مباحث غائب ہوجائیں گے۔

حکومت وقت کو بھی یہ سمجھانا ہوگا کہ ''اداریہ'' ختم ہونے سے پاکستان کا جمہوری تشخص متاثر ہوگا، پارلیمنٹ میں اس معاملے کو اٹھایا جائے اور حکومت کو یہ احساس دلایا جائے کہ ''اداریہ'' ختم ہونے کا تاثر عالمی سطح پر پاکستان کے لیے منفی پیغام ہوگا، اس کے لیے پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی جاسکتی ہے جو اخبارات کے نمائندوں اور صحافتی تنظیموں کے ساتھ مل کر ایک کوڈ آف کنڈکٹ تیار کرے تاکہ اخبارات ''اداریہ'' کو جاری رکھنے کے پابند رہیں۔

اخبارات کا اصل سرمایہ ان کے قارئین ہوتے ہیں، اگر قارئین یہ واضح پیغام دیں کہ وہ ''اداریہ'' کو ختم نہیں ہونے دیں گے، تو اخبارات کو اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی، قارئین خط لکھ کر، سوشل میڈیا پر مہم چلا کر، اور اخبارات کے دفاتر میں اجتماعی درخواستیں جمع کروا کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں، یہ دباؤ اخبارات کے مالکان کے لیے انتہائی مؤثر ثابت ہوگا۔

''اداریہ'' کو ختم ہونے سے بچانا محض ایک صحافتی مسئلہ نہیں بلکہ قومی وقار اور جمہوری بقا کا سوال ہے، یہ وہ آواز ہے جو عوام کی سوچ کو واضح کرتی ہے، حکومت کو آئینہ دکھاتی ہے، اور ریاستی اداروں کو ان کے اصل دائرہ کار میں رکھتی ہے، اگر ہم نے آج ''اداریہ'' کو زندہ رکھنے کے لیے اجتماعی کوشش نہ کی تو کل تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی، ''اداریہ'' محض الفاظ نہیں بلکہ ایک فکری مشعل ہے، جسے جلائے رکھنا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ❁

جنگ

جواہر لال نہرو نے ماسٹر تارا سنگھ کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا

روزنامہ جنگ کراچی کا 14 اکتوبر 1947ء کا پہلا شمارہ

"ماہنامہ اطراف کے اخباری اداریہ نمبر میں امریکی اخبارات کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ اس لیئے نیویارک میں اطراف کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر عاصم متین خان سے گزارش کی گئی کہ وہ بڑے بڑے امریکی اخبارات کا ایک جائزہ لے کر ان کے اداریوں کی اہمیت اور ماضی میں جمہوری اقدار کی ترویج میں ان کا کیا کردار رہا ہے۔ اس پر ایک تحریر سے نوازیں۔ ان کے شکریہ کے ساتھ یہ تحریر پیش کی جارہی ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔ امریکی اخبارات صرف امریکی رائے عامہ پر ہی نہیں عالمی رائے عامہ پر اثرانداز ہوتے ہیں۔"

بعض اداریوں نے امریکی حکومتوں سے فیصلے بھی بدلوادیئے

تحریر: عاصم متین خان
امریکہ میں 'اطراف' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر

پچاس ریاستوں اور 35 کروڑ کی آبادی والا امریکہ دنیا میں ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملک سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ کی اس ترقی اور طاقت کی وجہ اس ملک میں مضبوط تعلیمی نظام، آئینی حقوق کی ضمانت اور قانون کی بالادستی ہے جس نے عوام کو شعور دیا ہے۔ عوام کو اپنے حقوق سے اور ان کے حصول کے طریقہ کار سے آگاہی ہے اور اس تمام تر آگہی میں نہایت اہم کردار امریکی اخبارات نے ادا کیا ہے اور ان اخبارات کے ادارتی بورڈ نے اپنے اخبارات کے ادارتی صفحے کا درست استعمال کر کے اور پھر اس ادارتی صفحے کے مرکز یعنی اداریے نے امریکی عوام کی شعوری بیداری اور آگہی میں سب سے اہم کردار انجام دیا۔ سوشل میڈیا تو انتہائی ماضی قریب کی بات ہے اس سے قبل امریکہ کی ڈھائی سو سالہ تاریخ میں یہ کام امریکی اخبارات اور ان کے اداریوں نے اور ان اداریوں کو لکھنے والوں نے انجام دیا۔

امریکی اخبارات کے اداریوں کی اہمیت یہ ہے کہ ہمیشہ سے امریکی عوام کی رائے کو تشکیل دینے اور عالمی سطح پر امریکہ کی مخصوص شناخت بنانا پیش نظر رہا ہے۔ ان اخبارات کے اداریوں نے اہم قومی و بین الاقوامی معاملات، امن اور سلامتی پر عوامی رائے کو متاثر کر کے عوامی رائے کو صحیح سمت میں گامزن کیا ہے، جن میں سیاست، معیشت، سماجی مسائل اور عالمی پالیسیاں شامل ہیں۔ اور امریکی حکومت کو

The Weather
Today—Partly cloudy, warm, humid. High in the 90s, with a 20 per cent chance of rain decreasing to 40 per cent tonight. Friday—Partly sunny. Temperature range: Today, 75-91. Yesterday, 75-96. Details, Page B2.

The Washington Post
Times Herald

FINAL

94th Year ···· No. 208 — THURSDAY, JULY 1, 1971 — Phone 223-6000 — 10

Court Rules for Newspapers, 6-3

Vote at 18 Ratified Into Law

Move by Ohio Enacts 26th Amendment

Decision Allows Printing of Stories On Vietnam Study

By John P. MacKenzie

The Supreme Court settled a historic confrontation between government and press by ruling yesterday that The Washington Post and The New York Times are free to publish their stories about the secret Pentagon report on how America went to war in Vietnam.

War File Articles Resumed

عوامی رائے کا احترام کرتے ہوئے اپنی پالیسیاں تشکیل دینا پڑیں اور بعض اوقات امریکی حکومتوں کو اپنے فیصلوں پر نظرثانی کر کے مشکل فیصلے بھی کرنا پڑے۔

عام طور پر امریکی اخبارات کے ادارتی صفحے پر اخبارات کے مدیران ایک مؤثر پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں جہاں مصنفین اپنے خیالات اور آراء کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور عوام الناس اداریے اور ادرتی صفحے کے مضامین کو پڑھ کر اپنی رائے بھی دیتے ہیں جو اخبار میں عوام کے مراسلات کی شکل میں من وعن ادارتی صفحے پر شائع کر دیتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہ پاکستان کے متعدد بڑے اخبارات نے عوامی مراسلات کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبارات اور ان کے مالکان کو عوامی رائے کا کس قدر احترام ہے۔

درسگاہیں طلبہ وطالبات کو اخبارات سے تحقیق کی ہدایت دیتی ہیں

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد عالمی معاملات میں امریکہ سرگرم کردار ادا کرتا رہا ہے اگرچہ اس بارے میں تحفظات ہوسکتے ہیں کہ صحیح کردار تھا یا نہیں لیکن امریکہ کے تمام تر قومی اور بین الاقوامی

امریکی اخبارات کے اداریے

فیصلوں اور پالیسیز میں امریکی مفادات کو ہمیشہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔ امریکہ کے اخبارات اور ان کے ادارتی بورڈ امریکی حکومت کے فیصلوں اور پالیسیز کا جائزہ لے کر اپنے اداریوں میں اپنی رائے کا آزادی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ چاہے ان اداریوں کی رائے امریکی حکومت کے فیصلوں یا پالیسی سے متصادم ہی کیوں نہ ہو امریکی اخبارات کے مدیران اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ عوامی رائے کو تشکیل دینے کے لئے صحیح آگہی دیں جو آئین اور قانون کے مطابق ہو امریکی مفادات کا جائز تحفظ بھی کرے اور اخلاقی اور بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ کرے۔

قومی معاملات میں امریکی اخبارات کے اداریے داخلی سیاسی و سماجی معاملات کا جائزہ لے کر عوامی رائے کو صحیح سمت میں گامزن کرتے ہیں تا کہ صدارتی انتخابات، آئینی و قانونی معاملات اور عوام کے شہری حقوق سے متعلق معاملات پر کیئے جانے والے فیصلے اور اہم پالیسی سازی اور ان کا اطلاق صحیح طور سے کیا جائے۔

نیویارک ٹائمز کے اداریوں نے ویتنام جنگ کی مسلسل مخالفت کی

سماجی معاملات میں ان اداریوں نے خواتین کے حقوق سمیت مزدوروں کے حقوق اساتذہ کے حقوق طلباء کے حقوق کے علاوہ امریکہ میں رہنے والے غیر قانونی تارکین وطن کے حقوق پر بھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

دنیا بھر میں پرنٹ میڈیا پر آنے والے کڑے وقت کی وجہ سے اخبارات اور رسائل بہت مشکل دور سے گزر رہے ہیں متعدد بڑے اخبارات بند ہو چکے ہیں یا انہوں نے اپنی پرنٹ کی تعداد کو کم کر دیا ہے لیکن امریکہ اور یورپ میں پھر بھی اخبارات اور رسائل کو پڑھنے کا رجحان زیادہ کم نہیں ہوا کیونکہ ان تمام بڑے اخبارات اور رسائل نے پرنٹ میڈیا کی تعداد کو تو کم کیا ہے لیکن وہ اب ڈیجیٹل میڈیا پر عوام الناس کو دستیاب ہیں اور عوام اج بھی ان اخبارات اور رسائل سے ملنے والی معلومات سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان پڑھنے والوں میں اسکولوں کے طلبہ و طالبات بھی ہیں کیونکہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کرام اپنے طلباء کو راغب کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہوم ورک اور تحقیق کرنے کے لیے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیں اور اس کا ریفرنس بھی دیں کہ انہوں نے کہاں سے یہ تحقیق کی ہے جس کی وجہ سے طلبہ اور طالبات ابھی بھی اخبارات اور رسائل کے ڈیجیٹل پرنٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میرے زمانہ طالبعلمی میں پیں

"All the News That's Fit to Print"

The New York Times

LATE CITY EDITION

VOL. CXX... No. 41,431 — NEW YORK, THURSDAY, JULY 1, 1971 — 15 CENTS

SUPREME COURT, 6-3, UPHOLDS NEWSPAPERS ON PUBLICATION OF THE PENTAGON REPORT; TIMES RESUMES ITS SERIES, HALTED 15 DAYS

Nixon Says Turks Agree To Ban the Opium Poppy

PRESIDENT CALLS STEEL AND LABOR TO WHITE HOUSE

He Asks Both Sides to Meet

Pentagon Papers: Study Reports Kennedy Made 'Gamble' Into a 'Broad Commitment'

By HEDRICK SMITH

BURGER DISSENTS

First Amendment Rule Held to Block Most Prior Restraints

یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر براؤن کہتے تھے کہ ان کی کلاس میں آنے سے پہلے اخبار پڑھ کر ضرور آئیں اور اگر اخبار میں کچھ اور نہ پڑھ سکیں تو اخبار کے اداریے پر ضرور نظر ڈالیے گا کیونکہ اخبار کی اہم

خبر کے اندر کیا معاملہ ہے وہ آپ کو اداریے سے ہی پتہ چلے گا جو اخبار کا دل و دماغ ہوتا ہے۔

اپنے صحافتی نظریات کی وجہ سے امریکی اخبارات نہ صرف امریکہ میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ دنیا بھر میں بھی ان اخبارات سے استفادہ کیا جاتا ہے اور سب سے اہم صفحہ ان اخبارات کا ادارتی صفحہ اور سب سے اہم چیز ان صفحوں پر اداریہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے بڑے اخبارات میں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، لاس اینجلس ٹائمز، شکاگو ٹربیون وغیرہ شامل ہیں

نیویارک ٹائمز کی بنیاد 1851 میں رکھی گئی تھی۔ اس اخبار نے اپنی مضبوط ذاتی اقدار اور عمدہ تحریری مواد کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی طور پر ایک اہم مقام بنایا ہے۔ تاریخی طور پر نیویارک ٹائمز نے ہمیشہ اپنی آزادی تحریر پر زور دیا ہے۔ اخبار کے ادارتی صفحے نے ہمیشہ اہم موضوعات پر قارئین کو آگاہ کیا اور سماجی اور سیاسی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کیا۔

امریکی حکومت نے پینٹا گون پیپرز کی اشاعت روکنے کی ہر ممکن کوشش کی

نیویارک ٹائمز کے اداریوں نے ویتنام جنگ کی مخالفت میں نہایت اہم کردار ادا کیا ان اداریوں نے ویتنام کی جنگ سے متعلق حقائق پر بحث کر کے عوامی رائے کو تبدیل کرنے میں مدد کی اور حکومت وقت پر زور دیا کہ یہ جنگ امریکہ کے وسیع تر مفاد میں نہیں ہے۔

نیویارک ٹائمز کی طرح دیگر امریکی اخبارات نے بھی ویتنام کی جنگ کی مخالفت شروع کر دی جس کے نتیجے میں ایک عوامی رائے ابھر کر سامنے آئی اور دنیا بھر کی طرح امریکی ریاستوں میں بھی اس جنگ کے خلاف مظاہروں نے شدت اختیار کر لی بالاخر امریکی حکومت کو بڑے جانی و مالی نقصان کے بعد اس جنگ سے ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اس جنگ کے خاتمے کے لیے سب سے اہم ترین معاملہ پینٹا گون

پیپرز کی 1971 میں اشاعت تھی۔صحافتی تاریخ میں پینٹا گون پیپرز کی اشاعت ایک دلچسپ واقعہ ہے ان پیپرز کا حصول اور اس کی

واشنگٹن پوسٹ کے اداریوں نے امریکہ اور دنیا کے پالیسی سازوں میں اپنا مقام بنایا

اشاعت سے قبل نیویارک ٹائمز کے ادارتی بورڈ اور صحافیوں درمیان ہونے والی بحث، پبلشر اور قانونی ماہرین کے درمیان ہونے والی

The Weather

...day—Partly cloudy, high in the ...s, low in the 60s. Chance of rain 14 per cent through tonight. Wednesday—Fair, high in the 80s. Temperature range: Today, 84-63; Yesterday, 87-68. Details on C3.

The Washington Post

Times Herald

FINAL

Amusements B 8 | Financial D
Classified C 8 | Metro C
Comics B10 | Obituaries C
Crossword B 9 | Sports D
Editorials A20 | Style B
Fed. Diary B11 | TV-Radio B

6th Year .... No. 224 — TUESDAY, JULY 17, 1973 — Phone 223-6000

President Taped Talks, Phone Calls; Lawyer Ties Ehrlichman to Payments

Kalmbach Testifies Aide Approved Cash to Defendants

By Peter A. Jay
Washington Post Staff Writer

Former presidential assistant John D. Ehrlichman gave his explicit approval for the clandestine payment of about $220,000 to the defendants in last year's Watergate burglary, Herbert W. Kalmbach testified yesterday.

Kalmbach, President Nixon's personal lawyer and a high-powered Republican fund-raiser, told the Senate select Watergate committee that Ehrlichman assured him last July 26 that instructions he was receiving from John W. Dean III for distribution of money were given with the full authority of the White House behind them.

As he began a tale of secret meetings, code names and bundles of $100 bills, Kalmbach told the committee that after nearly a month of raising thousands of dollars for the Watergate defendants and their families he began to wonder about the propriety of what he was doing and sought reassurance from Ehrlichman.

Ehrlichman, who resigned April 30 as the President's top assistant for domestic affairs, told him he should continue his undercover work, Kalmbach said. Secrecy was essential, he said Ehrlichman told him, because, "but for the secrecy the whole assignment could get to the press and be misinterpreted . . . they (the press and the Democrats) would have our heads in their laps."

Under questioning by lawyers for the committee, Kalmbach said he at first assumed the money he raised was to be used to provide legal aid for the five—later seven—Watergate defendants and support for their families, not to buy their silence. It seemed "a very human thing," he said.

"The fact that I had been directed to undertake these

Herbert W. Kalmbach: President's lawyer tells of

Alexander Butterfield: Taping of conversations was

Principal Offices Secretly Bugged Since Spring, 1971

By Lawrence Meyer
Washington Post Staff Writer

President Nixon has been routinely taping all his conversations and meetings in the Oval Office and cabinet room of the White House, in his Executive Office Building office and on four of his personal telephones, former White House aide Alexander P. Butterfield told the Senate select Watergate committee yesterday.

Butterfield, now the Federal Aviation Administration administrator, said the tape recording began in the spring of 1971 and was intended "to record things for posterity for the Nixon library." Most participants in conversations with the President did not know they were being taped, Butterfield said, because only a few members of the White House inner circle were told about the several hidden recording devices.

Butterfield's testimony, acknowledged to be correct by the White House, indicates that the White House may have in its possession the means to prove that President Nixon knew nothing about the cover-up of the Watergate affair until March 21, 1973, as he has maintained, or that former White House counsel John W. Dean III was correct in testifying that President Nixon knew about the cover-up well before March 21.

Samuel Dash, chief counsel of the Senate committee said yesterday that the committee will request White House tapes for specific dates. Dash said there should be "no obstacle to giving us the actual recordings . . . It's late in the day for anybody to raise withholding that information."

Deputy White House press secretary Gerald L. Warren declined to comment yesterday when asked if the White

کشمکش بڑا ہی کٹھن وقت تھا۔ اخبار کے قانونی ماہرین کی مخالفت کے باوجود پینٹا گون پیپرز کی اشاعت نے اخبار کی جرأت اظہار اور تفتیشی صحافت کی عکاسی کی۔ اخبار کے ایڈیٹر ایبے روزنتھال اور صحافیوں نے ایک ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر خفیہ طور پر اس اسٹوری کی تیاری کی۔ روزنتھال کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر یہ اسٹوری جھوٹی ثابت ہوگئی تو اخبار کو شاید بند ہونا پڑے اور انہیں اور دیگر صحافیوں کو بھی جیل کا سامنا کرنا پڑے۔ اپنی کتاب میں ایبے روزنتھال لکھتا ہے کہ عوامی مفاد اور اخبار پر عوام کے اعتماد کو بحال رکھنے کے لیے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ان پیپرز کو ضرور شائع کیا جائے۔ اس اشاعت کے نتیجے میں حکومت کو نہایت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی حکومت نے سرتوڑ کوشش کی کہ وہ کسی طرح سے نیویارک ٹائمز کو روک سکیں کہ وہ ان پیپرز کو شائع نہ کرے۔ لیکن اخبار نے اپنے اداریوں میں مستقل یہی موقف اختیار کیا کہ ان پیپرز کی اشاعت امریکہ کے مفاد میں ہے اور اخبار

کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو صحیح معلومات فراہم کرے۔ کیونکہ ویتنام کے معاملے میں امریکی حکومت کی پالیسی اور اقدامات

دراصل وہ نہیں تھے جو حکومت عوام کو بتا رہی تھی۔ عوام کو اپنی حکومت کے جھوٹ، معلومات کو عوام سے چھپانے اور رازداری کے بارے

میں بھی پتہ چلا۔ حکومت وقت اپنی استدعا لے کر امریکی سپریم کورٹ تک پہنچ گئی کہ ان پیپرز کی اشاعت قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہے تاہم امریکی عدالت نے حکومتی مؤقف سے اتفاق نہیں کیا اور فیصلہ نیویارک ٹائمز کے حق میں دے دیا۔ اس فیصلے نے اور اس کے مضمرات نے معاشرے میں صحافتی آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

یو ایس اے ٹوڈے کے اداریے اکثر موضوع بحث بنے

نیویارک ٹائمز کے مدیر ایبے روزنتھال کی اپنے اداریوں میں صحافیوں کی حمائت بھی ایک قابل تقلید مثال ہے۔

1877 سے شائع ہونے والا واشنگٹن پوسٹ بھی ایک اہم اخبار ہے۔ اس اخبار نے اپنی سنجیدہ صحافت کے ذریعے عام امریکی عوام میں تو نہیں لیکن امریکہ میں اور بین الاقوامی طور پر پوری دنیا میں پالیسی سازوں میں ایک خاص مقام بنایا ہے۔ اخبار کے مالک

یوگین میئر نے 1930 کی دہائی میں اس بات پر زور دیا کہ اخبار کی اشاعت آزادانہ ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں اخبار کو ایک معتبر مقام حاصل ہوا۔

واشنگٹن پوسٹ کی تفتیشی رپورٹنگ اور اداریوں میں عوام کی صحیح رہنمائی نے امریکی رائے عامہ کو تیار کیا کہ امریکی صدر رچرڈ نکسن کا واٹر گیٹ کے معاملے میں ملوث ہونا ایک مجرمانہ اقدام ہے اور تمام تر تحقیقات کے بعد امریکی صدر کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ واشنگٹن پوسٹ میں اسکینڈل کی اشاعت کے بعد اخبار کے اداریوں نے عوام کی رائے بنانے کے لیے اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں واشنگٹن پوسٹ پر عوام کا اعتماد مزید مستحکم ہوا اور صدر نکسن کو مستعفی ہونا پڑا۔ واشنگٹن پوسٹ نے اب تک 60 سے زائد پلٹزر انعامات حاصل کیے ہیں، جو اس کی آزادانہ و اعلیٰ صحافتی اقدار پر اعتماد کا اظہار ہے۔

1847 سے شائع ہونے والا شکاگو ٹریبیون شکاگو کے سیاسی اور ثقافتی منظرنامے میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ شکاگو ٹریبیون نے بھی اپنے قارئین کو مطلع کرنے کے لیے وہی پالیسی اختیار کی جو اخبار نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نے ہمیشہ رکھی۔ شکاگو ٹریبیون کا مخصوص اور واضح تحریری انداز ہمیشہ سے قارئین کو مختلف موضوعات پر گہرائی سے آگاہ کرتا ہے۔ اس اخبار نے اپنے اداریوں میں کئی بڑے واقعات کی کوریج کی اور قومی و مقامی سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر عوامی رائے کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ شکاگو ٹریبیون کو وہ مقام حاصل نہیں جو نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ کو حاصل ہے۔ لیکن اپنی جگہ پر شکاگو ٹریبیون نے بھی اپنا کردار بہت اچھی طرح سے ادا کیا ہے۔

لاس اینجلس ٹائمز بھی ایک اہم امریکی اخبار ہے جو امریکی رائے عامہ کو تیار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور تاریخ میں متعدد بار اخبار میں متنازع اداریے شائع ہوئے ہیں، ان میں ایک خاص ایڈیٹوریل جو تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا، وہ "ہاٹ سکواٹ" کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ یہ اداریہ 1975 میں شائع ہوا اور اس نے امریکی عوام کو ایک مجرم کی سزا کے بارے میں حکومت کی پالیسیوں اور کارروائیوں کے متعلق بہت سی نئی معلومات فراہم کیں۔ اس اداریے میں دو قتل اور ایک زیادتی کے مجرم لینرڈ ایڈورڈ

کی سزائے موت کی حمایت کی گئی تھی۔ اگرچہ ایڈورڈز کی سزا برقرار نہ رہی، لیکن اس ایڈیٹوریل نے امریکہ میں سزائے موت اور مجرمین کے بارے میں بحث کو ایک بار پھر چھیڑ دیا۔ اگرچہ اخبار پر کچھ حلقوں کی جانب سے زبردست تنقید کی گئی لیکن ادارہ یہ اپنے اس موقف پر قائم رہا کہ اس طرح کے مجرمانہ فعل کے بعد سزائے موت پر عمل درآمد معاشرے میں بہتری کے لیے ضروری ہے۔ اس سے پیشتر بھی لاس اینجلس ٹائمز نے تاریخی طور پر مختلف سماجی مسائل جیسے کہ شہری حقوق، جنگ، اور معاشی پالیسیوں پر اپنے اداریوں میں جو موقف اختیار کیا ہے، اس نے ان موضوعات پر کی جانے والی بحثوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اخبار کو مختلف حلقوں کی طرف سے متعدد بار مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا 1910 میں اخبار کے ہیڈکوارٹر پر بم حملہ ہوا جس میں اخبار کے 21 ملازمین ہلاک ہوگئے تاہم اخبار اپنی آزادانہ پالیسی پر قائم رہا اور اپنی رائے کا اظہار اپنے اداریوں میں کرتا رہا۔

2006 میں ایران پر یکطرفہ بمباری کی حمایت اور ڈزنی پر شائع ہونے والی ایک رپورٹ پر متنازع اداریوں نے لاس اینجلس ٹائمز کی ساکھ کو متاثر کیا اور اخبار کو سخت عوامی ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔

اخبار یو ایس اے ٹوڈے امریکہ کا ایک مشہور اخبار ہے جو عام طور پر ہوٹلوں میں ہوائی اڈوں پر ٹرین اسٹیشن پر اور مرکز شہر کے اخباری اسٹالوں پر دستیاب ہوتا ہے اور عوام ان میں مختصر خبریں اور اس کے اداریے کو ضرور پڑھتے ہیں اس اخبار کی تاریخ میں متعدد بار اخبار کے اداریے موضوع بحث بنے رہے۔ ان میں سے ایک 9/11 کے حملوں کے بعد شائع ہونے والا اداریہ تھا۔ اس اداریے نے امریکی عوام کو حملوں کے بارے میں مکمل آگاہی دی اور حکومت کی کارروائیوں پر روشنی ڈالی، جس میں حملوں کی تفصیلات، متاثرین کے بارے میں تفصیل اور جوابی حکومتی ردعمل شامل تھے۔ اخبار نے اپنے اداریوں میں حکومت کی پالیسیوں پر تنقید بھی کی، خاص طور پر دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے۔ امن اور قومی سلامتی کے توازن پر بھی حکومتی ذمہ داری اور اقدامات اور حکومتی کمزوریوں پر بحث کی، جو آج تک اس متنازعہ موضوع پر تحقیق اور بحث کرنے والوں کے لئے ایک اہم دستاویز ہے۔ اگرچہ اخبار کو تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا تاہم اخبار نے اپنے اداریوں میں عوام کو آزادانہ صحافت کے ذریعے صحیح اور درست معلومات فراہم کرنے کے اپنے موقف کی بھرپور حمایت کی اور امریکی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا۔

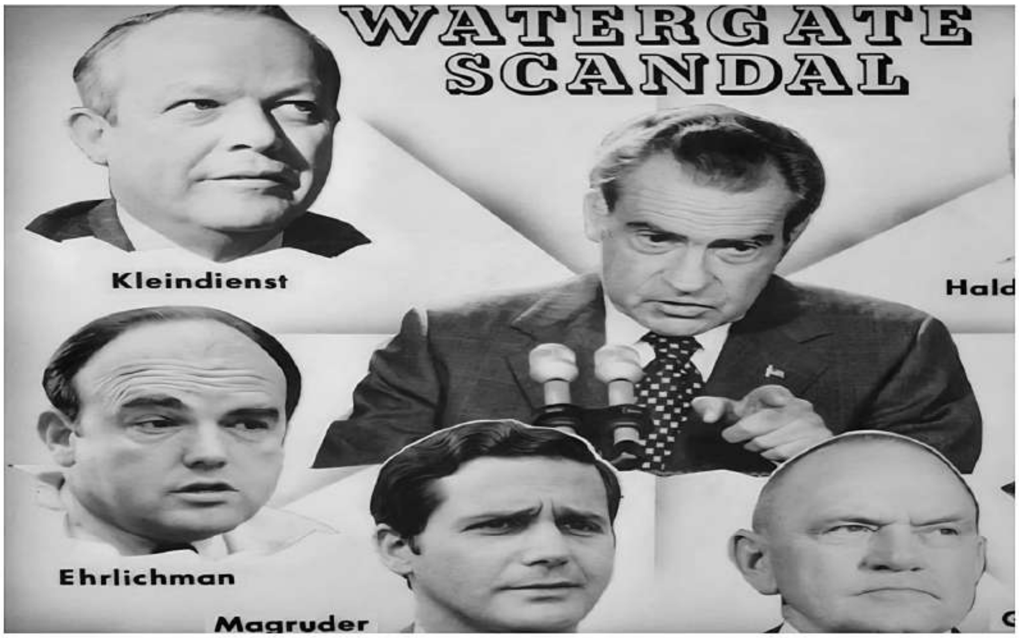

نیویارک پوسٹ مسلمانوں اور سیاہ فاموں کے خلاف اداریے لکھتا ہے

امریکہ میں قدامت پسند اور یہودی لابی کی آواز نیویارک سے شائع ہونے والا روزنامہ نیویارک پوسٹ ہے۔ یہ اخبار اہم قومی و بین الاقوامی معاملات پر ہمیشہ ایک متنازع موقف اختیار کرتا ہے اور اپنے اداریوں میں اس کا برملا اظہار کرتا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی مخالفت میں یہ اخبار امریکہ میں سب سے آگے ہے اور اس اخبار کا بس نہیں چلتا کہ دنیا بھر میں اور امریکہ میں ہونے والی مجرمانہ یا دہشت گردانہ کارروائیوں کی بھی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سر پر تھوپ کر مسلمانوں کو بدترین سزا دی جائے۔ غزہ میں جاری اسرائیل کی بربریت کی نہ صرف حمایت کرنا بلکہ ہر طریقے سے ان کارروائیوں کو جائز قرار دینا اس اخبار کا شیوہ ہے۔ یہ اخبار نہ صرف مسلمانوں کا دشمن ہے بلکہ تارکین وطن اور امریکہ میں صدیوں سے مقیم سیاہ فاموں کا بھی مخالف ہے۔ آزادی صحافت کا جس قدر ناجائز فائدہ نیویارک پوسٹ نے اٹھایا ہے شاید ہی وہ کسی اور اخبار نے کبھی انسانی وصحافتی تاریخ میں کیا ہو۔

غرض یہ کہ زیادہ تر امریکی اخبارات نہ صرف امریکی رائے عامہ بلکہ دنیا بھر میں عوام کے حقوق، آئین اور قانون کی بالادستی، امن و سلامتی، سائنس، معیشت اور عوامی فلاح و بہبود پر ایک متوازن تجزیہ فراہم کرتے ہیں۔ اور محض اخبار کی خبر پڑھ کر عوام درست رائے قائم نہیں کر سکتے تاہم اخبار کا اداریہ جو انتہائی سوچ بچار، باریک بینی، احتیاط اور جذباتیت سے بالاتر ہو کر مرتب کیا جاتا ہے وہ قارئین کی صحیح رہنمائی کرتا ہے اور معاشرے میں ایک مثبت اور تعمیری رائے قائم کرنے میں مشعل راہ ہوتا ہے! ❁

بلوچستان میں چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ شعلے کبھی بھی بھڑک سکتے ہیں۔ اطراف ہمیشہ قلات پبلشرز کے نذر زمرد صاحب کو زحمت دیتا ہے کہ بلوچستان میں کتابوں کے ادب کے یا سیاست کے تعلیم کے حوالے سے وہی ہماری مدد کرتے ہیں۔ اخباری اداریہ نمبر کے لیے بھی ہم نے ان سے ہی درخواست کی۔ ان کا شکریہ کہ انھوں نے وحید زہیر صاحب سے ایک مبسوط تحریر بھجوائی۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔

بلوچی اخبارات نے ہمیشہ بے باکی سے اداریے قلمبند کیے

وحید زہیر کی انتہائی جامع تحریر (کوئٹہ سے)

اداریہ نویسی کی طاقت اداروں سے پوچھا جائے۔ جنھیں اداریوں سے یہی قومی وبین الاقوامی پالیسیوں، ناقص یا ٹھوس منصوبہ بندی اور مسائل ومشکلات پر قلم کی کاٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ ون یونٹ کے خاتمے میں اخبارات ورسائل کے اداریوں نے کردار ادا کیا جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا یا انگریزوں کی آمد ملک میں کالونیل نظام پر لکھے گئے اداریوں سے جو آگاہی عوام کو ملی وہ بھی کھلی تاریخ ہے۔

اخبارات کی پالیسی اور نظریات کا اندازہ ان کے اداریوں سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے انہی اداریوں کی پاداش میں ہمیشہ صحافت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی رہی ہیں۔ بلوچستان میں غلام محمد شاہوانی کے نوائے بلوچستان ہفت روزہ میزان میں لکھے گئے اداریے حکمرانوں کو ہضم نہ ہونے کی وجہ سے نہ انہیں صرف گرفتار کیا گیا جرمانہ بھی کیا گیا نوائے وطن میں ملک پناہ اور نوائے بولان میں بابو عبد الرحمان کے بھی اداریے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے اداریے بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپے بابو عبدالکریم شورش کے نوکین دور کے اداریے بھی مخاطبین کی نیندیں حرام کرتے تھے۔ ابھی حال میں ہی ڈاکٹر شاہ محمد مری کے سنگت کے اداریے کئی والیم میں چھپے ہیں۔ یہ بات تو سمجھ آنے والی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کی آمد سے بعض روایتی اشیاء یا ابتدائی مشینریوں اور کام کے قدیم طریقوں کا کسی حد تک مقصد فوت ہو چکا ہو۔ کہیں پر خوبصورتی اور کہیں تیز رفتاری اہم ثابت ہو رہی ہو۔ مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ملکی قوانین اور اداروں کی اپنی پالیسیاں بے مصرف ثابت ہوں یہ بات ہر باشعور انسان کو کھٹک رہی ہے۔ اخبار اور جرائد تو اپنی اور حکومت کی پالیسوں کو مشتہر کرنے کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی تناظر میں لکھے گئے اداریے پالیسی سازوں اور حکمرانوں کے رویوں اور کارکردگی کا اہم اظہار ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اہل حکمرانوں کے لیے اداریے اپنی کارکردگی درست کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے۔ غاصب اور نا اہل اکثر اداریوں پر جزبز ہوتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ناراضگی کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ حکومت کے متعلقہ اداروں کے اخباری تراشوں میں اداریوں کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہا ہے۔

بلوچستان میں ایسے تاریخی شواہد ملتے ہیں کہ ماضی میں لکھے گئے اداریوں کی وجہ سے کئی نامور صحافی اور انکے اخبارات ورسائل زیر عتاب آتے رہے ہیں کیونکہ صحافت میں اداریئے ہی پیچ میں یکتا رہے ہیں۔ موجودہ میڈیا پر پابندیوں کی وجہ سے جب خبریں درست سمت میں شامل اشاعت نہیں ہو رہی ہیں تو یقینا ادارے محض اپنے اداریوں پر اکتفا نہیں کر سکتے کیونکہ اداریے تو سیاسی خواص کے لیے لکھے جاتے ہیں ان کی نازک مزاجی اور زود رنجی جنگ کے اداریوں کا سلسلہ بند کرنے کا تاثر کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک آدھ کالم نگاروں نے یہ تاثر دیا ہے کہ خوبصورت اور با مقصد اداریے لکھنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں شاید متعلقہ اخبار کو بھی یہ مسئلہ درپیش ہوگا۔ میں اس بات سے ہرگز متفق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے اداروں کے لیے اداریے لکھوانا کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہو۔ ملک میں نامور صحافیوں کی کمی نہیں بے شمار تھنک ٹینک جیسی قابلیت رکھنے والی ہستیاں ابھی موجود ہیں۔ چونکہ سیاسی پارٹیوں سے لے کر حکمرانوں تک دانشوروں کو دھتکارنے کا عمل جاری ہے۔ اگر یہ زیادتی اب میڈیا کے ساتھ کسی بھی صورت میں روا رکھا جانے کا آغاز ہو چکا ہے تو پھر اس قوم کا خدا ہی حافظ۔ آئندہ قیمتی مشوروں، تجزیوں اور تنقید سے بیزاری سے جو مسائل جنم لینگے پالے رہے ہیں اس کا ادراک حکمرانوں کو ہونا چاہیے۔ فکر سے خالی سطحی تحریروں سے بھلا قوم کی کونسی خدمت ہو سکتی ہے یا ملک میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ اداریوں پر قدغن یا بندش سے کئی سوال اٹھ رہے ہیں۔ اس قبل سرکاری ریڈیو، ٹی وی کو غیر فعال کرنے پر اہل دانش پریشان ہیں۔ جس کا جواز آج تک حکمران پیش نہیں کر سکے ہیں حالانکہ جو مثبت کارکردگی اور پروپیگنڈہ ٹی وی اور ریڈیو کا خاصہ رہا ہے اس کی گواہی

اداریے کی طاقت
اداروں سے پوچھیے

ان چینلوں سے وابستہ افراد بخوبی دے سکتے ہیں۔ یا جنھوں نے پی ٹی وی کے عروج کا زمانہ دیکھا ہو۔ کیا نیشنل سینٹروں کے قیام اور کارکردگی سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ بلوچستان میں جہاں بعض ادارے ختم کئے گئے ہیں وہیں علمی سرگرمیوں پر پابندی اور غیر محسوس طریقے سے تعلیمی اداروں کے لئے جو مسائل پیدا کیے جا رہے ہیں اس بات پر اہل علم و دانش انتہائی متفکر نظر آتے ہیں حالانکہ آتش

بازوں۔ کھیلوں اور موسیقی کے مخصوص پروگراموں پر اربوں روپے خرچ

کردگی کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ نظریاتی صحافت میں محض سب اچھا حکومتوں اور عوام کے ساتھ دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ شاید روزنامہ

نوکیں دور میں بابو عبدالکریم شورش کے اداریے حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیتے تھے

کیے جا رہے ہیں۔ لیکن جامعات کے پروفیسر اپنی تنخواہوں اور پنشنز پر ہمیشہ سراپا احتجاج نظر آتے ہیں۔ پہلے پہل یہ خبر کی سرخیاں بنتی

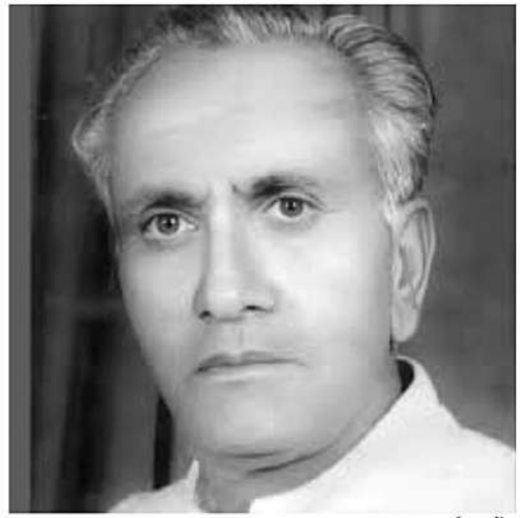

تھیں۔ کسی بھی پابندی یا نمایاں ہونے پر حکمرانوں کے تلملانے کے

جنگ بھی مسلسل ایڈوائس سننے سے اکتا چکا ہوگا۔ موجودہ مسائل کی ایک بڑی وجہ کرپشن اور نا اہل ارباب کی فیصلہ سازی بھی ہو سکتی ہے۔ جہاں قومی جذبوں کا فقدان ہوگا وہاں دور اندیشی فیصلے بھی نہیں ہونگے اور نہ ہی متعلقہ محکموں میں متعلقہ قابلیت رکھنے والے میسر ہونگے۔ میں بلوچستان کی بات کرونگا جہاں اسمبلی فورم پر ایک خاتون رکن اسمبلی بول چکی ہیں کہ اعلیٰ افسران کی تعیناتی پر بولیاں لگتی ہیں۔ جس کا جواب کسی بھی فورم سے نہیں آیا ہو سکتا ہے یہ وطیرہ دوسرے صوبوں میں بھی چل رہا ہو۔ ایمانداری سے حکمران اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتائیں اس وقت قوم کے ساتھ کس قسم کا انصاف ہو رہا ہے۔ ایک ہی بات سمجھ آتی ہے اگر واقعی کوئی با اختیار شخص اس ملک بدنامی کے داغ دھو سکتا ہے تو اسے اپنے ادارے ٹھیک کرنے پر پہلی فرصت میں توجہ دینی ہوگی۔ قلم اور کتاب کی حرمت کو بحال کرنا ہوگا، اہل افراد کی فوقیت کے معاملے کو سمجھنا ہوگا۔ اخباری

ملک پناہ، بابو عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر شاہ محمد مری کے اداریے: ضمیر کی آواز

پیش نظر ایسے قومی مسائل کو اداریوں میں شامل کیا جاتا تھا تاکہ پالیسی ساز اپنے اقدامات اور رویوں پر نظر ثانی کریں۔ اب جب اخبارات سے اداریے غائب ہونگے تو حقائق کی نشاندہی کہاں اور

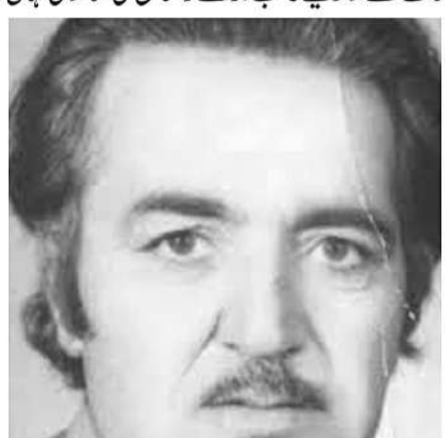

بابو عبدالرحمٰن

کس فورم پر یقینی اور مناسب ہوگا۔ اداریوں میں حکومتی اعلیٰ کار

صنعت کو ملکی مفاد میں اسکا جائز مقام دینا ہوگا۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرونک میڈیا ہو بین الاقوامی سطح پر طے شدہ ٹرم اور کنڈیشن ماننے ہونگے قوم کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے والے اداروں میں خرید و فروخت، دھونس دھمکیوں جیسے نقصان دہ رویوں سے دور رکھنا ہوگا، ان اداروں سے وابستہ نابغہ روزگار شخصیات کو قوم اور ملک کے لیے غنیمت جان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی علم پر جہالت کو فوقیت دینے کے گناہ سے توبہ کرنی ہوگی۔ جھوٹ پر سچ کا گلہ دبانے سے تنزلی کے سوا کچھ نہیں ملنا اس وقت اداریہ نویسی کو خیر باد کہنا انتہائی تشویشناک صورتحال کی نشاندہی کے سوا کچھ نہیں۔ ماضی میں صحافتی اداروں پر ہر قسم کی آفت آن پڑی ہے۔ مگر ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے کہ صحافت ہی چھوڑی جائے یا اداروں کی وقعت اور اہمیت سے انکار کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔ کیا بھٹو حکومت، ضیاء اور مشرف یا ایوب حکومت اور مارشلاؤں پر لکھے گئے اداریے، تجزیوں میں نمایاں خدشات سے کوئی ذی شعور انکار کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کا الگ ہونا بھٹو کی پھانسی ضیاء

دور کے غلط فیصلے ملک میں اسلحہ اور منشیات کی دوڑ، مشرف کی بگٹی سے دشمنی، امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانا، بے نظیر بھٹو کی شہادت، الزام تراشیاں، حکومتوں کے خاتموں کو آج غلط حکمرانی کا نام نہیں دیا جا رہا۔ ون یونٹ کے بعد تمام قومی اخبارات کا بلوچستان پر بھی اثر و نفوذ رہا روزنامہ ''انتخاب'' اور ''آزادی'' جیسے موقر اخبارات نے بھی عوام کی بھرپور نمائندگی کی۔ ان کے اداریے بھی ہر دور میں شاندار رہے انہیں بھی ہمیشہ حکمرانوں کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بحر حال اخبارات یا رسائل اور الیکٹرونک میڈیا کے خلاف سازشوں کا اعلیٰ سطح پر نوٹس لیا جانا چاہیے۔ ایک بڑی اور اہم صنعت کے ساتھ کسی بھی قسم کا غلط برتاؤ کا مطلب اپنے عوام کو دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر رکھنا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی

روزنامہ انتخاب اور آزادی نے عوام کی بھرپور نمائندگی کی

اور بالادستی میں سب سے زیادہ حصہ علم کا ہے۔ علم کے تمام ذرائع سے روگردانی سے جہالت کو فروغ ملے گا۔ پاکستانی عوام کی ترقی کو روکنا کہاں کی دانشمندی ہے، خوف اور بدامنی کی وجہ سے جہاں ملک

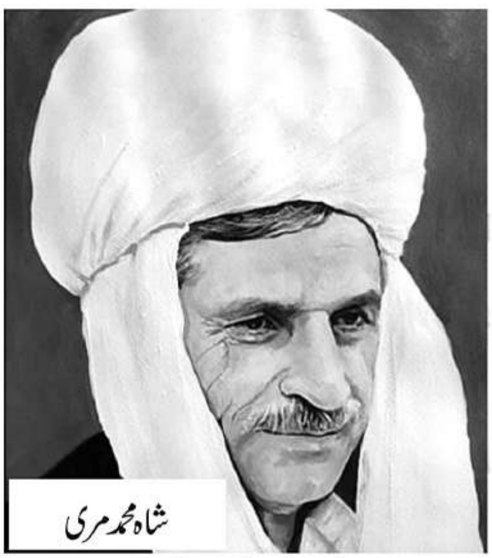

شاہ محمد مری

میں سرمایہ کار، سیاح نہیں آئیں گے وہیں ملک کے اندر پیدا ہونے والی بے چینیوں سے مزید خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہوگی۔ جہاں تک ہم سچ سننے کی عادت پیدا نہیں کریں گے من حثیت القوم جھوٹے ہی کہلائیں گے۔ جب ہر سطح پر انصاف میسر ہوگا جھوٹ سچ میں سے خود بخود غائب ہوتا جائے گا اور سب میں تعمیری تنقید کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ دنیا میں ہم بھی باوقار کہلا سکیں گے۔ آخری بات یہ جرنلزم کے طالبعلم کا ایک سوال ہے کہ آئندہ کیا نصاب میں اداریہ نویسی شامل نہیں کیا؟ ❀

ماہنامہ اطراف کے ''اخباری اداریہ نمبر'' کے لیے سندھی اخبارات میں اداریے بہت اہمیت کا موضوع تھا کیونکہ سندھی اخبارات قیامِ پاکستان سے پہلے سے بہت ولولہ انگیز اداریے لکھتے آرہے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے اردو سندھی کے ممتاز ایڈیٹر اور سندھ پبلک لائبریری کے بانی جناب جاوید مہر سے درخواست کی۔ وہ خود بھی بے باک اداریے لکھنے کی پاداش میں اخبار بدر ہو چکے ہیں۔ بہت ہی عرق ریزی سے انھوں نے سندھی اخبارات کے ماضی حال کا احاطہ کیا ہے۔ اور اہم اداریہ نویسوں کے حساس اداریوں کا ذکر کیا ہے۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجیے۔

سندھی اخبارات میں اداریہ آج بھی مقدس

جاوید مہر کی اہم تحریر

اداریہ کیا ہے؟ اس کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب 80 کی دہائی میں اپنے والد محترم مرحوم سیف الدین کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ان دنوں ہمارے گھر روزنامہ ''عبرت'' اور ''ہلال پاکستان

جناب عثمان ڈیپلائی

'' اخبارات آیا کرتے تھے، جو سندھی زبان میں تھے، والد صاحب کی بینائی تھوڑی کم ہوئی تو ان کو اخبار پڑھ کر سنانا میری ذمہ داری تھی، یہیں سے میری اخبار بینی کا آغاز ہوا، جو مجھے صحافت تک کھینچ لایا، میں بابا کو اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سناتا تھا، ایک دن بابا نے کہا کہ یہ اخبار تو تم پڑھ کر سنا دیتے ہو لیکن اخبار کیا کہتا ہے وہ بھی تو پڑھ کر سنایا کرو، جس پر میں نے کہا بابا روزانہ اخبار ہی تو آپ سنتے ہیں اور کیا پڑھ کر سناؤں؟ تو کہنے لگے کہ بیٹا اخبار کا اداریہ پڑھ کر سنایا کرو، خبریں تو تمام اخبارات میں ہوتی ہیں، اصل تو اداریہ ہوتا ہے، جس سے حقائق اور سچائی کا پتہ چلتا ہے، اداریہ حالات کا نچوڑ ہوتا ہے، بابا کے اتنے مفصل تبصرے کے بعد ادارتی صفحہ کھول کر دیکھا، جسے پہلے نظر انداز کر دیتا تھا۔

میں نے یہ جو اتنی ساری تمہید باندھی اس کا کوئی اور مقصد نہیں، صرف یہ بتانے کی کوشش ہے کہ کسی بھی اخبار میں اداریے کی کتنی اہمیت ہے اور مجھے آج بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اتنے اہم حصے کو پاکستان کے ایک بڑے اخبار نے حذف کر لیا، کچھ روز قبل

مولانا دین محمد وفائی

سوشل میڈیا پر انکشاف ہوا کہ روزنامہ جنگ نے ادارتی صفحے پر اداریہ ختم کر دیا ہے، یہ پڑھ کر ذرا بھر بھی یقین نہیں ہوا، کیونکہ یہ کوئی چھوٹا اخبار تو کر سکتا ہے لیکن دنیا میں پاکستان کے حوالے سے بڑا نام رکھنے والے روزنامے سے ایسی امید کم تھی، اس لیے فوری طور پر ''جنگ'' اخبار کھول کر دیکھا اور انتہائی حیرت ہوئی کہ واقعی یہ خبر

درست تھی، کچھ سینیئر صحافیوں کا خیال تھا کہ شاید یہ ایک دو روز ایسے ہو اور پھر عوامی ردعمل کے بعد دوبارہ اداریہ شروع کیا جائے، لیکن لگتا ہے اب جنگ میں اداریہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔

میری تحریر کا مرکزی نقطہ سندھی اخبارات میں اداریے کی اہمیت پر مبنی ہے، کوشش ہوگی کہ پڑھنے والوں کو یہ بتا سکوں کہ سندھی اخبارات میں اداریوں کو کتنا اہم سمجھا جاتا تھا اور اب بھی کئی اخبارات میں اس کی اہمیت پہلے جیسی ہے، اسی وجہ سے ادارتی صفحات پر ایسے نامور لکھاریوں کو رکھا جاتا ہے جو قلم کے تقدس کا خیال رکھیں اور کسی دباؤ میں آئے بغیر کھل کر لکھیں، اگرچہ تمام سندھی اخبارات کی اب یہ صورتحال نہیں لیکن اس کے باوجود روزنامہ کاوش،

سندھی اخبارات میں اداریے کی اہمیت

روزنامہ پنھنجی اخبار، روزنامہ عوامی آواز، روزنامہ ہلال پاکستان روزنامہ عبرت، روزنامہ ہلچل اور روزنامہ سندھ ایکسپریس ابھی تک یہ علم لیکر چل رہے ہیں۔

''الوحید'' سندھی صحافت میں مرکزی حیثیت

سندھی صحافت میں روزنامہ الوحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو

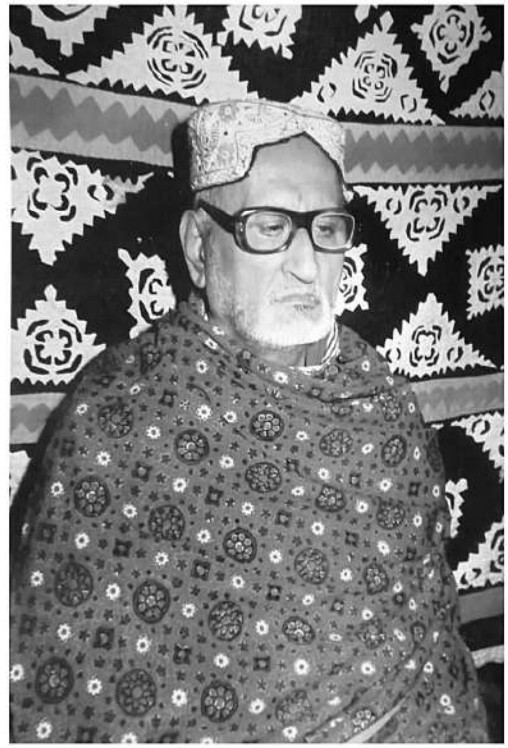

مولانا دین محمد وفائی صاحب نے شائع کیا یہ اخبار اُس دور کے حساب سے عوام کی آواز بنا، مولانا دین محمد وفائی نے جہاں خبروں کی اشاعت کو آزاد طریقے سے ممکن بنایا وہاں وہ ادارتی صفحات کو بھی شاندار انداز میں پیش کرتے رہے، ان کے اداریے جاندار ہوا کرتے تھے جو اس وقت کے لوگ بڑی اہمیت سے پڑھتے تھے، الوحید کے بعد اگر ہم دیکھیں تو عبرت اخبار کا دور بڑی اہمیت کا حامل رہا، محمد عثمان ڈیپلائی صاحب نے یہ اخبار جاری کیا، عثمان ڈیپلائی صاحب نہ صرف صحافی تھے بلکہ وہ اچھے ناول نویس، کہانی نویس اور شاعر بھی تھے، اس وجہ سے ان کے قلم میں ایک عجیب قسم کی طاقت محسوس ہوتی تھی جس میں عوام کا درد شامل ہونے کے ساتھ حکمرانوں کے جھوٹے وعدے بے نقاب ہوتے تھے، اس دوران کئی جید صحافی سامنے آئے، ہلال پاکستان میں سراج الحق میمن کے اداریوں کو ٹرینڈ سیٹ قرار دیا جاتا تھا، سراج الحق میمن وہ صحافی تھے جنہوں نے سندھی زبان کو اردو کے کئی الفاظ کے اچھے تراجم دیئے، مثال کے طور پر ماضی میں وزیر اعلی کو سندھی میں بھی وزیر اعلی لکھا جاتا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ سراج الحق میمن نے شاید پہلی بار وزیر اعلی کے لیے سندھی میں ''وڈو وزیر'' متعارف کرایا، مطلب وزیروں کا چیف قرار دیا، اسی طرح روزنامہ عبرت میں شیخ عزیز صاحب نے انتہائی شاندار اداریے لکھے، شیخ عزیز صاحب وہ صحافی تھے جو بیرون ملک سے صحافت کی ڈگری لے کر آئے، ہم یہاں سندھی صحافت کے ایک اور بہت بڑے نام شمشیر الحیدری صاحب کا ذکر نہ کریں تو سندھی صحافت کی اداریہ نویسی ادھوری کہلائی جائے گی، روزنامہ مہران کی ادارت کے دوران انہوں نے انتہائی سخت قسم کے اداریے لکھے یہ دور ایم آر ڈی تحریک کا بھی تھا، جس میں ان کے ایک ایک لفظ کی بڑی اہمیت ہوتی تھی، شمشیر الحیدری صاحب نے کچھ اداریے اقساط پر مبنی بھی لکھے، کسی سے سنا ہے کہ ایک بار شمشیر الحیدری نے اداریہ لکھا تو پیر صاحب پگارا جو مہران اخبار کے مالک تھے، انہوں نے ان سے کہا کہ آپ کہیں اور نوکری ڈھونڈیں ہم ساتھ نہیں چل سکتے، جس پر کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ شمشیر الحیدری نے کہا کہ انہیں آج کا دن کام کرنے دیں کیونکہ اداریے کی قسط لکھنی ہے وہ لکھ کر کل سے وہ نہیں آئیں گے۔

عثمان ڈیپلائی حکمرانوں کو بے نقاب کرتے تھے

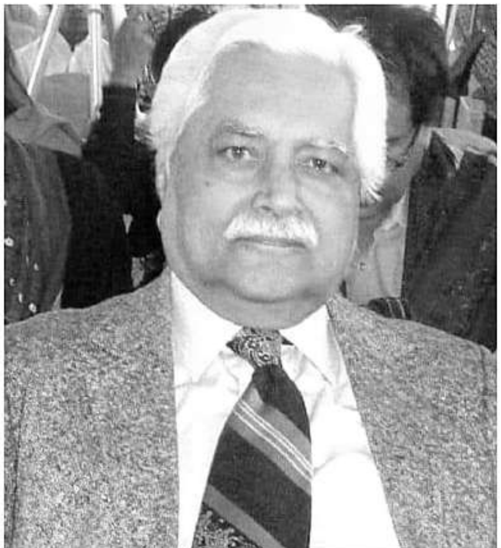

سراج الحق میمن

مولانا دین محمد وفائی کے اداریے بہت پڑھے جاتے تھے

جیسا کہ میں نے پہلے ہی بتا دیا کہ سندھی اخبارات میں اداریے کی بڑی اہمیت رہی ہے اس وجہ سے ایسا دور بھی آیا کہ سندھی اخبارات کے مالکان سندھی صحافت میں چن چن کر ایسے صحافیوں کو منتخب کیا کرتے تھے جو اچھے اداریے لکھیں، مرحوم فقیر محمد لاشاری سندھی صحافت کا وہ پہچان ہے جن کا نام سن کر ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ ان کے اداریے آج تک بھی یاد ہیں، یہ بہت کم ہوا ہے کہ کسی صحافی یا ایڈیٹر کے اداریوں کی کتاب شائع ہوئی ہو، لیکن فقیر محمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے اداریوں کی دو جلدوں پر مبنی کتاب موجود ہے، فقیر محمد

سراج الحق میمن کے اداریے رجحان ساز بنے

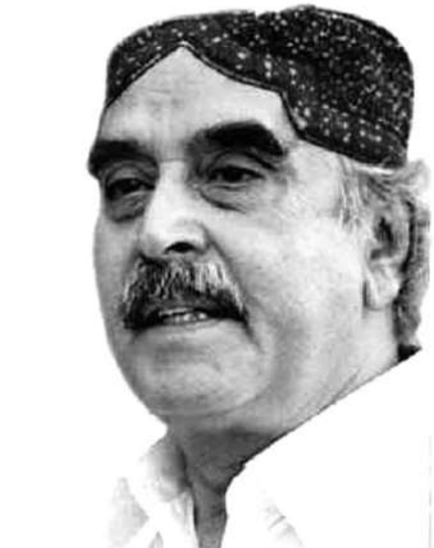

انور پیرزادو

لاشاری کئی اداریے کمپیوٹر آپریٹر کو فی البدیہ لکھوایا کرتے تھے، مجھے یاد ہے کہ لوگ ان کے اداریے پڑھنے کا انتظار کیا کرتے تھے کیونکہ

سندھی صحافت میں کئی ایسے واقعات ہیں جن کو اخبارات نے خبروں میں تو بہتر طریقے سے پیش کیا ہی کیا لیکن اداریتی صفحات کا اس میں

ایم آر ڈی کے دور میں شمشیر الحیدری نے سخت اداریے لکھے

آغا محمد سلیم

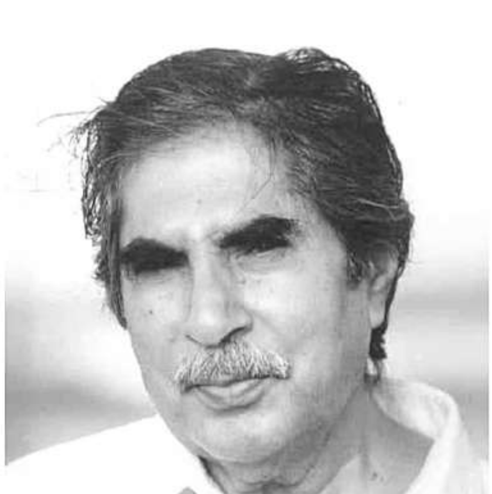

شیخ ایاز

وہ انتہائی بے باکی سے قلم کا استعمال جانتے تھے، اسی دور میں انور

فقیر محمد لاشاری کے اداریے سب سے زیادہ یاد رکھے گئے۔ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے

پیرزادہ، اقبال دل اور بدر ابڑو صاحب نے بھی اخبارات میں اداریے لکھے۔

فقیر محمد لاشاری

بھی قابل ذکر حصہ رہا، سب کو یاد ہوگا کہ ٹنڈو بہاول کا واقعہ جس میں سات دیہاتیوں کو را کا ایجنٹ اور ڈاکو قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا تو یہ سندھی اخبارات تھے جنہوں نے ان مظلوموں کا مقدمہ لڑا، جس کے باعث میجر ارشد گرفتار ہوئے یہ پاکستان کی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ تھا جس میں سندھی صحافت نے اتنا شاندار مقدمہ لڑا کہ حاضر

کئی مسائل پر سندھی اخبارات نے مشترکہ اداریے بھی لکھے

سروس میجر کو تختہ دار پر چڑھنا پڑا، اس طرح اور بہت سے واقعات ہیں جس میں کالا باغ ڈیم کا معاملہ سرفہرست ہے یہ وہ ایشو ہے جس پر ایک سندھی روزنامہ کے اسٹاف نے ایڈیٹر سمیت استعفیٰ دے دیا تھا کیونکہ انہوں نے کالا باغ ڈیم کی حمایت میں حکومتی اشتہار شائع کرنے سے انکار کیا تھا۔

شیخ ایاز سندھی زبان کے بہت بڑے شاعر رہے، انہوں نے آغاز تو

شیخ ایاز کے اداریے ''برسات'' میں پڑھنے کو ملے

اردو شاعری سے کیا مگر آگے چل کر وہ سندھی کے بڑے شاعر بن گئے، انہیں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بعد بڑا شاعر کہنے والے بھی بہت سے لوگ ملیں گے، شیخ ایاز شاید 1994 میں کراچی سے شائع ہونے والے سندھی اخبار روزنامہ برسات کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کے مداحوں سمیت اخباری دنیا سے وابستہ لوگوں کو پہلی بار ان کے اداریے پڑھنے کو ملے، شیخ ایاز کیونکہ شاعر تھے اور ان کا صحافت سے تعلق نہیں تھا، اس لیے ان پر تنقید بھی ہوئی لیکن وہ بطور ایڈیٹر اداریے لکھتے رہے، یہ سندھی صحافت میں شاید پہلی بار ہوا کہ کسی ایڈیٹر نے اداریے کے اختتام پر اپنا نام لکھا، شیخ ایاز کے اس عمل پر بھی تنقید ہوئی لیکن تمام تر تنقید کے باوجود وہ اپنا نام نیچے لکھا کرتے تھے، ان کے اداریے لازمی طور پر کسی جذبات کی بجائے مدلل، ادبیانہ اور شاعرانہ الفاظ پر مبنی ہوا کرتے تھے، اس لیئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر اخبارات کے صحافتی زبان سے مختلف تھے، اسی طرح روزنامہ جاگو میں 1997 میں سندھی زبان کے ایک اور بہت بڑے مصنف آغا سلیم صاحب ایڈیٹر بن کر آئے، ان کا انداز بھی شیخ ایاز کے اداریوں کی طرح تھا۔

سندھی صحافت میں اداریے کی اہمیت کو اس بات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ماضی میں سندھ کے کئی مسائل پر مشترکہ اداریے بھی لکھے گئے، نہ صرف اداریے لکھے گئے بلکہ مقالہ خصوصی کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا جو مشترکہ طور پر تمام اخبارات صفحہ اول پر ایک ہی مقرر کردہ جگہ پر شائع کرتے تھے، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھی اخبارات میں اداریہ نویسی کی بہت اہمیت ہے، اداریے کی حمایت میں اور بہت سے دلائل پیش کر سکتا ہوں مگر بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی اس

وجہ سے اسی پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ اداریے کی اہمیت ہے اسے ختم نہیں ہونا چاہیے، اس سے ہی اخبار کی پالیسی واضح ہوتی ہے کہ اخبار کیا کہنا چاہ رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے، افسوس کی بات ہے کہ روزنامہ ''جنگ'' نے اپنے اس حق کو اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفن کر دیا۔ ❀

ماہنامہ اطراف کا اخباری اداریہ نمبر ماشاءاللہ۔ وقیع اور کئی زبانوں کو محیط ہو گیا ہے۔ اخلاق احمد ساغر صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے پنجابی اخبارات کے اداریوں سے متعارف کروایا ہے۔ وہ بجا طور پر کہہ رہے ہیں کہ کئی وجوہ کی بنا پر اگرچہ پنجابی اخبارات محدود ہے۔ مگر ان کے اداریے بہت موثر اور موقر ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

پنجابی اخبارات عوامی شعور اور لسانی شناخت کے عکاس

تحریر: اخلاق احمد ساغر

اخبارات کسی بھی معاشرے کی فکری، سماجی اور سیاسی راہ نمائی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان ہی اخبارات میں شائع ہونے والے اداریے دراصل وہ آئینہ ہوتے ہیں جو نہ صرف ادارے کی پالیسی، سوچ اور رویے کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ قاری کو موجودہ حالات پر فہم و ادراک کا نیا زاویہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ پنجابی اخبارات کے اداریے اپنی زبان، موضوعات اور اسلوب کے باعث دیگر زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کا اداریہ اس کی فکری سمت اور ادارتی پالیسی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

بھلیکھا۔ لوکائی۔ سجن پنجابی اداریہ نگاری کو زندہ رکھ رہے ہیں

پنجابی زبان چوں کہ برصغیر کے کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے، اس لیے پنجابی اخبارات کے اداریے براہِ راست عوامی دل و دماغ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یہ اداریے عام فہم اور سادہ زبان میں تحریر کیے جاتے ہیں تاکہ دیہی اور شہری زندگی کے عام قاری تک ان کی بات بآسانی پہنچ سکے۔ ان میں اکثر مقامی محاوروں، کہاوتوں اور دیہی زندگی کے استعاروں کا استعمال ملتا ہے جو قاری کو اپنی زبان اور ثقافت کے قریب لے آتا ہے۔

بھارت کے پنجابی اخبارات کے اداریے زیادہ موثر

پاکستان میں پنجابی اخبارات کی تعداد محدود ہے لیکن جو اخبارات شائع ہو رہے ہیں وہ اپنی زبان اور عوامی مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ روزانہ بھلیکھا (Bhulekha) لاہور سے شائع ہوتا ہے اور اس کے اداریے عموماً پنجابی زبان کے فروغ اور صوبائی حقوق پر مرکوز

تعداد محدود، لیکن صوبائی حقوق پر توجہ مرکوز

رہتے ہیں۔ روزانہ لوکائی (Daily Lokaai) بھی لاہور سے نکلتا ہے اور دیہی مسائل کو اپنے اداریوں میں نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح سجن (Sajjan) ایک تاریخی پنجابی روزنامہ ہے جس کے اداریے عوامی بیداری اور لسانی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستان میں وسائل کی کمی اور حکومتی سرپرستی کے فقدان کے باوجود یہ اخبارات پنجابی اداریہ نگاری کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بھارت میں پنجابی زبان کو صحافت میں زیادہ پذیرائی حاصل ہے، اسی لیے وہاں کے اخبارات کے اداریے زیادہ اثر انگیز ہیں۔ اجیت (Ajit) جالندھر سے شائع ہوتا ہے اور سب سے بڑے پنجابی روزنامے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کے اداریے کسان تحریکوں، صوبائی سیاست اور سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ پنجابی ٹریبیون (Punjabi Tribune) چندی گڑھ سے نکلتا ہے اور جدید

آن لائن جرائد اور سوشل میڈیا نے پنجابی اداریوں کو نئی زندگی دی ہے

مسائل، تعلیمی اصلاحات اور سماجی تبدیلیوں کو اداریوں میں پیش کرتا ہے۔ جگ بانی (Jag Bani) جالندھر اور لدھیانہ سے شائع ہوتا ہے اور عوامی مسائل کے ساتھ ساتھ ریاستی معیشت پر بھی اداریے لکھتا ہے۔ اسی طرح روزانہ سپوکس مین (Rozana Spokesman) اور نواں زمانہ (Nawan Zamana) بھی کسانوں، مزدوروں، تعلیم اور ثقافت جیسے موضوعات پر اداریے شائع کرتے ہیں۔

پنجابی اخبارات کے اداریے بنیادی طور پر عوامی شعور کی بیداری کا ذریعہ ہیں۔ ان میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل، پنجابی زبان اور ثقافت کے فروغ، صوبائی سیاست اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا وصف ان کی زبان اور اسلوب ہے جو پیچیدہ فلسفیانہ اصطلاحات سے پاک ہوتا ہے اور عام قاری کی سمجھ کے قریب تر رہتا ہے۔

پنجابی اخبارات کے اداریوں کو کئی مسائل کا سامنا بھی ہے۔ پاکستان میں قارئین کا زیادہ رجحان اردو اور انگریزی اخبارات کی طرف ہے، جس سے پنجابی اخبارات کے اثرات محدود رہ جاتے ہیں۔ مالی وسائل اور ادارہ جاتی سرپرستی کی کمی بھی ان کی ترقی کی راہ میں

رکاوٹ ہے۔ ڈیجیٹل دور میں پنجابی رسم الخط کے مسائل بھی آن لائن اشاعت کو مشکل بناتے ہیں۔ اس کے باوجود آن لائن جرائد اور سوشل میڈیا نے پنجابی اداریوں کو نئی زندگی دی ہے اور آج کے دور میں پنجابی بلاگرز اور آن لائن اخبارات کے اداریے لاکھوں قارئین تک پہنچ رہے ہیں۔

مستقبل میں اگر پنجابی اخبارات کو حکومتی سرپرستی، مالی وسائل اور ادارتی تربیت فراہم کی جائے تو یہ نہ صرف عوامی رائے سازی میں زیادہ موثر ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ پنجابی زبان کے فروغ اور ثقافتی شناخت کے تحفظ کا بھی اہم ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بھلیکھا، لوکائی، سجن، اجیت، پنجابی ٹریبیون، جگ بانی اور سپوکس مین جیسے اخبارات کے اداریے پنجابی زبان کی بقا اور اس کے فکری ارتقا کی ضمانت ہیں۔ یہ اداریے عوامی آواز بھی ہیں اور پنجابی قومیت اور ثقافت کا تحریری ریکارڈ بھی۔ ۞

”ماہنامہ اطراف کے ”اخباری اداریہ نمبر“ کے لیے ہم نے اُردو کے نامور ادیب۔ اینکر پرسن، براڈ کاسٹر، سنیئر شاعر جناب ناصر علی سید کو زحمت دی۔ ان کا شکر یہ کہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس مشکل موضوع کو نبھایا۔ ان کی نثر اردو پڑھنے بولنے والوں میں نہ صرف پاکستان بلکہ امریکہ یورپ میں بھی بہت مقبول ہے۔ پشتو اخبارات کی تعداد بھی محدود ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اداریہ ترک نہیں کیا۔ روزنامہ ”وحدت“ بہت طمطراق سے شائع بھی ہوتا ہے۔ اور عوامی مسائل پہ اس کا اداریہ بھی بہت پڑھا جاتا ہے“

کوئی پشتو اخبار بغیر اداریے کے شائع نہیں ہوتا

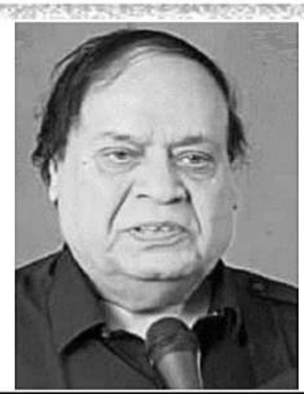

تحریر: ناصر علی سیّد

کسی سے سن لیا ہو گا کہ دنیا چار دن کی ہے

عزیز میاں قوال کی قوالی کا انداز یوں تو اپنے دور میں قوالی کے رائج انداز کے مطابق ہی تھا لیکن پھر بھی وہ اس انداز کو مزید پر جوش بنانے کے لئے بیٹھے بیٹھے اچانک گھٹنوں کے بل اٹھ جایا کرتے تھے جس سے سننے والوں میں بھی ایک جوش سا بھر جاتا تھا چونکہ وہ ادبیات کے طالب علم تھے اس لئے ان کے اشعار کا انتخاب بھی لا جواب ہوتا تھا۔ ایک شعر جو یوں تو بہت سے قوال سنایا کرتے تھے لیکن عزیز میاں کی بات ہی اور تھی وہ خود بھی مزے لیتے ہوئے سنایا کرتے تھے۔

مرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
کسی سے سن لیا ہو گا کہ دنیا چار دن کی ہے

فنی نقص کے باوجود یہ شعر بہت مقبول رہا ہے مجھے اس میں دوسرے مصرعے کا پہلا ٹکرا ”کسی سے سن لیا ہو گا“ بہت اچھا لگتا ہے مجھے کیا بہت سے لوگ سنی سنائی پر عمل کرنے ہی میں عافیت سمجھتے ہوئے خوش رہتے ہیں آج کا دور تو خیر سوشل میڈیا کے ”راج“ کا ہے اور ’ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے‘ سب کے سب نے اپنی آنکھیں، سماعتیں اور ہوش حواس جو پہلے ٹیلی ویژن کے پاس گروی رکھے ہوئے تھے اب وہاں سے چھڑا کر سوشل میڈیا کے پاس رہن رکھ لئے ہیں اسی طرح پہلے جن دیواروں کے کان ہوا کرتے تھے اب اُن دیواروں پر آنکھیں بھی اگ آئی ہیں اور مزے کی بات کہ ’آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے‘ وہ اب لب پر آ سکتا ہے اور کچھ اس شور سے آتا ہے کہ گزشتہ کل کا روزمرہ زندہ ہو جاتا ہے کہ ’ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی‘ لیکن اب وہاں سے اڑ کر میرؔ جی کے شعر کی طرح ”روئے زمیں

Daily WANDAT Peshawar
ورځپانه
وحدت
پېښور
مؤسس: پیر سید سعید شاہ ھمدرد
17 اگست 2021
د بی ټی اے کابل ایرپښن وخنډول شو
دطالبانو دا زمینت وخت اوس پیل شو
ملا برادر

تمام لے لیتی ہے“ اور یہی کچھ آج کل ایک عمدہ بیانیہ بنانے کے اوزار ہیں یہ بیانیہ ویسے تو خیر بہت پرانا ہے کہ ”ہم ایک بے چہرہ معاشرے میں سانس لینے پر مجبور ہیں“ مگر اسے بھی اب کے دن لاٹھی چارج سمیت دیگر مظالم روا رکھے جا رہے تھے تو اس وقت پرنٹ میڈیا اپنے سنہرے دن انجوائے کر رہا تھا تب وہ اخبارات جو ”جابر حکمران“ سے ’پوچھ‘ کر کلمہ حق پڑھنے کی بدعت سے ’ابھی‘ کوسوں دور تھے وہ سہولت سے لکھ رہے تھے کہ موجودہ حکومت اپنے انتخابی وعدوں میں بار ہا یہ کہہ چکی ہے کہ وہ اس ملک سے ”غربت ختم کر کے ہی سانس لے گی“ اسلئے اس وعدے کا آسان حل یہی ہے کہ ”غریب“ کو ختم کیا جائے تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری! بالکل اسی طرح سوشل میڈیا نے ہر اس شخص کو جس کے

پہلا باقاعدہ پشتو روزنامہ ”باگرام“ پھر ”وحدت“ کی دھوم

پاس یہ چھوٹی سی ڈیوائس یعنی سیل فون ہے ہر شعبے کا ماہر بنا دیا ہے وہ سیاست، ثقافت اور کھیل سے لے کر ادب و فلسفہ تک کے موضوعات پر بے تکان بولنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو گیا ہے، یہ اور بات کہ ’اس کام کی اُسے ذرا بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے جو ہوا‘ سوشل میڈیا نے ہی دی ہے اور مختلف کارٹون، ٹک ٹاک، ریلز، اور پوسٹس کے ذریعے ایک بیانیہ بلکہ ایک نیا اظہاریہ مرتب ہونے لگا ہے یعنی اب ہم بے چہرگی کے دور میں زندہ ہیں، ماضی میں جب ایک سیاسی پارٹی کے دور حکومت میں مزدوروں پر آئے

اسے کرنا ہے اس لئے اب ''احساس بیگانگی'' سے لے کر بے چہرگی تک کا بیانیہ بھی لاؤڈ ہوتا جارہا ہے، حفیظ جالندھری نے بجا کہا ہے

ذہن پہلے ٹی وی کے گروی تھے
اب سوشل میڈیا کے پاس

کہ'' تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی'' اس طوالانی تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایک قومی اخبار نے پہلے اپنے اخبار سے خبروں کو آہستہ آہستہ دیس نکالا دینا شروع کر دیا پھر رفتہ رفتہ یہ روش سب اخبارات نے اپنانی شروع کر دی۔ چونکہ چھوٹے اور علاقائی اخبارات کے پاس بڑے اور قومی اخبارات کی طرح اشتہارات تو تھے نہیں سو نہیں فلاح کی راہ یوں میسر آئی کہ انہوں نے پہلے پہل اخبارات کے صفحات کا سائز کم کرنا شروع کر دیا گویا آٹھ کالم کی بجائے سات کالم کا صفحہ متعارف کرایا اور پھر اس پر بھی بات نہ بنی تو ان اضبارات نے کاغذ کی مہنگائی کا بہانہ کر کے صفحات کم کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ وار شائع ہونے والے کئی ایڈیشن ختم ہو گئے، بچوں کا صفحہ، خواتین کا صفحہ اور ادبی صفحہ یہ ہمیشہ نشانے پر رہتے ہیں لیکن شو بز کا صفحہ ختم تو نہیں ہوتا آدھا اور مزید آدھا کر دیا جاتا ہے البتہ ہر بار پراسرار طور پر سپورٹس کا صفحہ کم ہی چھیڑا جاتا ہے، پختونخوا میں اگر

پہلے اخبارات نے خبروں کو خارج کیا، پھر صفحات کم کیے

چہ صحافتی ادب کا آغاز 1854 میں ایک ادبی اور دینی مجلہ ''اسلام'' سے ہوا جس کے مدیر عبدالغفور سید بابا تھے لیکن صحافت کا یہ طویل سفر ماہناموں اور ہفت روزوں تک ہی محدود رہا، البتہ بانگ حرم شہباز، جہاد، انجام سرحد اور انقلاب سمیت کچھ اور اردو کے روزنامہ تھے جن میں ایک صفحہ پشتو کے لئے بھی مختص تھا البتہ ہمیش خلیل کی ادارت میں شائع ہونے والا ''باگرام'' غالباً پہلا باقاعدہ اور مکمل پشتو روزنامہ تھا جس کے بعد بھی پیر سفید شاہ ہمدرد نے 1985 کے آس پاس روزنامہ 'وحدت' پشتو شروع کیا جو اب بھی اسی طمطراق سے شائع ہو رہا ہے جس میں شروع دن سے اڈیٹوریل پیج شامل ہے۔ جس میں اداریہ اور کالم شائع ہوتے ہیں (اس اخبار کے اوائل میں بطور کالم نگار میں بھی جڑا رہا'' لیکن اس ساری تفصیل کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ اردو پشتو یا کسی بھی زبان کا کوئی روزنامہ اداریہ کے بغیر شائع نہیں ہوا البتہ اس بیچ وہ سیاہ دور ضرور آیا ہے جب اخبارات ترتیب پانے کے بعد اشاعت سے پہلے سنسر ہوتے تھے تب خبروں اور کالم کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پورا اداریہ اڑا دیا جاتا تھا، اور ایک آدھ بار ایک قومی اخبار نے اداریہ کی خالی جگہ پر یہ مصرع بھی لکھ دیا تھا کہ

''کجا دانند حال ماسبکساران ساحل ہا'' لیکن یہ جو ہم اب دیکھ رہے ہیں یہ نہ سنا نہ دیکھا پشاور کے اخبارات میں بھی ایڈیٹوریل پیج کو بھی پہلا آدھا کر لیا گیا پھر اس میں سے کچھ عرصہ کے لئے کالم سرے سے غائب کر دیئے گئے (غنیمت ہے کہ اب پھر سے ایک اہم اخبار میں کالم کی اشاعت بحال کر دی گئی ہے۔) لیکن اداریہ بہر حال کسی بھی دور میں ختم نہیں ہوا، البتہ خبروں کے انتخاب میں ان کی پالیسی تبدیل ہوتی رہتی ہے ویسے بھی کسی ستم ظریف نے خبر کی یہ تعریف کی ہے کہ ''کتا آدمی کو کاٹ لے تو یہ خبر نہیں ہے'' (گویا یہ ایک معمول کی سرگرمی ہے) البتہ اگر آدمی کتے کو کاٹ لے تو یہ خبر ہے'' (شاید اس لئے خبروں میں آنے کے لئے یار لوگوں نے پہلے پہل کتے اور پھر گدھے کاٹ کھانا شروع کر دیئے) لیکن ایک بڑے قومی اخبار سمیت بہت سے اخبارات نے خبروں کا بائیکاٹ کر

بڑے قومی اخبار نے
اپنا چہرہ ہی ہٹا دیا

کے اخبارات میں محض اعلانات شائع شروع کر دیئے تھے'' صدر مملکت نے یہ کہا وزیر اعظم نے یہ فرمایا، حکومت نے یہ اعلان کیا وغیرہ'' انتظار حسین نے اس زمانے کے ایک کالم میں لکھا تھا'' کہ سارا سال چونکہ کرکٹ میچ نہیں ہوتے اس لئے اخبارات تھوڑا سا حصہ ادب کے لئے بھی وقف کر دیتے ہیں، اس لئے کبھی کبھار اعلانات کے بیچ ایک آدھ خبر بھی لگ جاتی تھی کہ'' فلمسٹار میرا جی نے نئی فلم سائن کر دی'' یا سید نور کی اگلی فلم کی ہیروئن اس بار بھی صائمہ نور ہو گی'' اس قومی اخبار کی ہر اشاعت اشتہارات کے بوجھ تلے دبی ہوتی لیکن اس سب کچھ کے باوجود اک صفحہ نہ جانے کیونکر مالکان کی دست برد سے بچا ہوا تھا جسے ادارتی صفحہ کہتے ہیں، اس میں کچھ کالمز اور اداریہ ہوتا ہے۔ یہ صفحہ اخبار کے مزاج، پالیسی اور خال وخد کا ایک طرح سے آئینہ دار ہوتا ہے، اور بطور خاص اداریہ کو تو اخبار کا چہرہ کہا جاتا ہے، اب جب کہ سوشل میڈیا اور ادبی دنیا میں بے چہرگی کا چرچا عام ہوا ہے تو اس بڑے قومی اخبار نے عوام کے مزاج کے سارے موسموں کا ساتھ بننے کے شوق میں اپنا چہرہ ہی ہٹا دیا ہے۔ جس طرح ہمارے آج کے تعلیمی اداروں میں تعلیم میں سے علم کو منہا کر کے ایجوکیشن ود آوٹ نالج پڑھائی جا رہی ہے، اسی طرح سوشل میڈیا پر دھمال ڈالتی ہوئی جدید حسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے مالکان نے اخبار سے اداریہ کو منہا کر دیا گیا۔ کیا کہا جا سکتا ہے بجز اس کے کہ

''بر ایں عقل و دانش بباید گریست''

روزنامہ الجمعیت ہفت روزہ چٹان اور روزنامہ امروز کے اداریے

تحریر: محمود شام

ادارے سے میرا تعلق خاطر میٹرک کرنے سے پہلے سے ہی ہو گیا تھا جھنگ شہر میں گھر پر لاہور سے روزنامہ امروز ہفت روزہ چٹان ہفت روزہ خدام الدین آتے تھے۔ دہلی سے روزنامہ الجمعیت ڈاک سے روزانہ آتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ نویں جماعت میں میں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہفت روزہ ''گلستان'' نکالنا شروع کیا۔ جس کی کاربن کاپیاں آٹھ دس بناتا تھا۔ اپنے کچھ ہم جماعتوں تک پہنچاتا۔ اس میں بھی ایک اداریہ "ابتدائے عشق" کے نام سے لکھا تھا۔ یہ 11 اگست 1957 کا شمارہ ہے۔ قیمت ایک پیسہ

اس اداریے کی آخری سطر یہ ہے" ابھی آزادی اچھی طرح نہیں ملی ہے آپ کو آزادی کی جدوجہد جاری رکھنا چاہیے"

والد محترم حکیم صوفی شیر محمد ہماری زبان تلفظ بہتر کرنے کے لیے روزنامہ ''الجمعیت'' دہلی کا اداریہ مجھ سے سنتے تھے۔

بی اے کے امتحان کے بعد نتیجہ آنے تک کافی وقت تھا۔ جھنگ شہر سے مولانا نظام الدین انصاری ایک ہفت روزہ "صنعتی پاکستان" شائع کرتے تھے۔ میں نے رضا کارانہ طور پر اس کی لیتھو کتابت بھی کی اور اداریہ بھی لکھا۔

پھر جب 1963 میں لاہور میں ہفت روزہ قندیل میں ایک اسسٹنٹ کے طور پر وابستگی ہوئی اس کا اداریہ زیادہ تر تو محترم ایڈیٹر شیر محمد اختر لکھتے تھے۔ ایک بار مجھے لکھنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے مغربی پاکستان ون یونٹ کے اس وقت کے بہت طاقتور وزیر شیخ مسعود صادق کے ایک بیان پر زیادہ بے باکی سے لکھ دیا۔

" ذمہ داروں کی غیر ذمہ داری"

ان دنوں نوائے وقت کے اداریے پڑھ کر بہت جوش آ جاتا تھا۔ مگر یہ اداریہ پریس سے واپس آ گیا۔ اس وقت ادارے کی پالیسی یہ تھی کہ ہفت روزہ " قندیل" ملکی سیاست سے دور رہے گا۔ پرنٹنگ پریس میں بھی ایسے تجربہ کار سیاسی اور صحافتی فہم رکھنے والے مقرر کیے جاتے تھے۔ جو اشاعت سے قبل ہر صفحے پر نظر ڈالتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شیر محمد اختر صاحب نے بھی مجھے بلا لیا۔ ہم دونوں نے مل کر وہ اداریہ تبدیل کیا۔

پھر وقت آیا کہ میں ایم اے کا امتحان دے کر فارغ ہو گیا اور" نوائے وقت" میں صبح سے ڈیوٹی پر جانے لگا۔ تو مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ" نوائے وقت" کے جن اداریوں کی ان دنوں دھوم تھی۔ وہ سینئر ایڈیٹر جناب بشیر احمد ارشد لکھتے تھے۔ مجھے ان کی معاونت پر مامور کیا گیا۔ جو یقیناً ایک اہم صحافتی ذمہ داری تھی۔ بشیر احمد ارشد مختلف سفارت خانوں کی آنے والی پریس ریلیز کی خالی پشت کو آدھا موڑ کر ان پر اداریہ لکھتے تھے۔ ان کے سامنے اپنے نکات ہوتے تھے اور وہ دو دو سلپ لکھ کر مجھے دیتے اور یہ کہتے کہ یہ اچھی طرح دیکھ کر کتابت کے لیے دے دیں۔ میں عرض کرتا کہ'' میری یہ مجال کہاں کہ آپ کی تحریر دیکھوں''۔

امروز

نئی ذہنیت اور نئے ڈھنگ

کا

روزانہ اردو اخبار

پہلا پرچہ ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو شائع ہو رہا ہے

مگر انہوں نے پہلے دن ہی یہ نصیحت کی کہ جب آپ اخبار کے اداراتی صفحات کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہوں۔ تو پھر یہ آپ کا فرض بن جاتا ہے۔ تحریر کسی کی بھی ہو اسے خود دیکھ کر اشاعت کے لیے دیں۔ یہ مثال بھی دی کہ اس وقت ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کے سب

ہفت روزہ ''قندیل'' میں ایک اداریے نے مسائل کھڑے کر دیے

سے محترم استاد اور ناقد ہیں۔ ان کا مضمون بھی اگر چھپنے کے لیے آئے تو آپ بغیر دیکھے نہ دیں۔

ایوب خان کا دور تھا ''نوائے وقت'' کے اداریوں کا ہر طرف چرچا تھا۔ حمید نظامی مرحوم جو مشعل روشن کر گئے تھے اور جسے مجید نظامی ہاتھوں میں لے کر چل رہے تھے۔ اس کے اداریے کی ذمہ داری بشیر احمد ارشد نبھا رہے تھے جو بہت ہی نازک مگر بھاری منصب تھی۔ سخت احتیاط درکار تھی۔ میں نے اسی ڈیوٹی میں اخبار نویسی اور ادارت کے بنیادی اصول سیکھے۔

پھر ہم "اخبار جہاں" کے لیے کراچی منتقل ہوئے تو ایک عرصے تک تو دوسرے صفحات کی ادارت میرے ذمہ تھی۔ مجھے لگتا تھا اداریہ نویسی بہت مشکل ذمہ داری ہے۔ ان دنوں جناب عبدالکریم عابد اخبار جہاں کے اداریے لکھ رہے تھے پھر ایک وقت آیا کہ مجھے پورے اخبار جہاں کی ادارت سونپ دی گئی تو میر خلیل الرحمن کے چھوٹے بھائی میر حبیب الرحمن نے پہلے سے بلا کر پوچھا کہ کیا آپ یہ بارِ گراں سنبھال لیں گے۔ میں نے یہی عرض کیا کہ بس اداریے میں آپ کی مشاورت درکار ہوگی۔ یہ معرکہ بھی بخیروخوبی سر ہو گیا۔

اپنا ہفت روزہ "معیار" بھٹو دور میں نکالا تو اس میں یہ تجربہ کیا کہ باضابطہ اداریے کی جگہ ایڈیٹر کا صفحہ شروع کیا۔ اس پر ایک عرصے تک یہ سطر بھی جاتی رہی۔

"ادارے سے میرا تعلق 1957 سے"

"ایڈیٹر کا صفحہ جس سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں" اردو اخبارات میں ایڈیٹر کے نام خطوط مراسلات شائع ہوتے تھے مختلف عنوانات کے تحت۔ مگر ہر اخبار میں یہ جملہ ضرور لکھا جاتا تھا

نہیں ہے۔ آپ زرضمانت جمع کروائیں۔ جب وہ جمع نہیں ہوتا تھا ۔رسالے بند کر دیے جاتے تھے۔ پھر جب 1994 میں روزنامہ جنگ میں بطور ایڈیٹر کراچی شمولیت کی تو اداریے لاہور سے اتے

ایوبی دور میں ''نوائے وقت'' کے اداریوں کی دھوم تھی

"ایڈیٹر کا مراسلہ نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

پھر رفتہ رفتہ اردو اخبارات نے مراسلات کا اہم گوشہ ختم کر دیا جس سے عوام کی آواز خاموش کر دی گئی۔ اب مراسلات انگریزی

تھے جناب ارشاد احمد حقانی بہت ہی سینیئر ایڈیٹر وہ یہ نازک ذمہ داری نبھاتے تھے۔ جب وہ عبوری حکومت میں بطور وزیر اطلاعات ونشریات شامل ہوئے اور جنگ سے چھٹی پر چلے گئے تو اڑھائی تین ماہ تک میں نے ہر صبح بلا ناغہ اداریے لکھے۔ ان دنوں مکمل آزادی تھی کھل کر لکھا جا سکتا تھا۔

ٹی وی چینلوں کی آمد کے بعد خبروں کا سلسلہ رات دن جاری رہنے لگا تو صبح سویرے لکھا جانے والا عام طور پر بے وقت محسوس ہونے لگا۔ سالہا سال سے قیام پاکستان سے پہلے سے بھی اور بعد میں بھی ہر زبان کے اخبار میں یہ اہتمام ہوتا تھا کہ اداریہ نویس سب سے پہلی شفٹ میں دفتر پہنچتے تھے ان کو مقامی اخبارات کی پوری فائل دی جاتی تھی تاکہ وہ ان میں سے خبریں دیکھ کر اداریے کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کر لیں۔ ان دنوں خبر کا سرچشمہ صرف اخبارات ہی ہوتے تھے۔ لیکن چینلوں کی آمد کے بعد اب خبر کا مرکزی وسیلہ برقی میڈیا بن گیا۔ اس لیے صبح کا موضوع کا انتخاب پرانا ہونے لگا۔ میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا پھر جب روزنامہ "جہان پاکستان" شروع کیا گیا۔ ہم نے یہ طے کیا یہ اداریہ صبح نو بجے کے بجائے رات نو بجے کا بلیٹن سن کر لکھا جائے۔ کالموں کا صفحہ الگ

میاں نواز شریف سے ''جنگ'' کی جنگ میں اداریوں کا مرکزی کردار

اخبار کے ایڈیٹر ان چیف میر شکیل الرحمان اکثر اوقات موضوع تجویز کر دیتے تھے۔ بعض اوقات باقاعدہ تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا ۔ پھر جب میاں محمد نواز شریف نے "جنگ" پر یلغار کی تو ایڈیٹوریل اور زیادہ توجہ اور زیادہ تیاری اور جوش و جذبے سے لکھے گئے۔ مقالہ خصوصی بھی فرنٹ پیج پر ایک دو بار شائع ہوا۔ اخبار چار صفحات کا رہ گیا تھا لیکن اداریہ شامل اشاعت ہوتا رہا۔ نواز حکومت ان اداریوں

کر دیا گیا۔ وہ پہلے چھپنے چلا جاتا تھا اداریے کا صفحہ خبروں کے صفحات کے ساتھ پریس میں جاتا تھا۔ اس طرح یہ بھی ہوا کہ بڑے بڑے اخبارات روزنامہ ڈان روزنامہ جنگ وغیرہ کے اداریے "جہان پاکستان" کے اداریے کے مقابلے میں کم از کم دو دن پرانے ہونے لگے۔

انگریزی اخبارات نے تو اداریہ تاخیر سے لکھنا شروع کیا اور وہ خبروں کے صفحات کے ساتھ ہی پریس میں جاتا تھا۔ لیکن اردو اخبارات نے پرانا انداز ہی رکھا اور اداریہ پہلی شفٹ میں ہی لکھا گیا تھا۔ اس لیے اداریہ اپنی اہمیت کھونے لگا اور موضوع غیر متعلقہ ہوتے گئے۔

ہفت روزہ معیار میں اداریے کی جگہ ایڈیٹر کا صفحہ۔۔۔

روزناموں میں روزانہ آدھے صفحے پر محیط ہوتے ہیں۔ ہم نے ماہنامہ اطراف میں نیا تجربہ کیا کہ انگریزی اخبارات میں چھپنے والے خطوط کا انتخاب ہر مہینے شائع کرتے ہیں اس میں ہمیں ڈاکٹر سید جعفر احمد کی نگرانی اور انسٹیٹیوٹ اف ہسٹوریکل اینڈ سوشل ریسرچ کا تعاون حاصل ہے۔

ہفت روزہ معیار کا ڈکلریشن ہمارے بعض اداراتی نوٹس یعنی شذرات پر ہی پاکستان پریس پبلیکیشنز آرڈیننس 1964 کے تحت منسوخ کیا گیا۔ پہلے ایک نوٹس اتا تھا اور حکم دیا جاتا تھا یہ اداراتی نوٹ فلاں فلاں شق کے تحت آرڈیننس کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے اس کی وضاحت کریں اور آپ بیس ہزار زرضمانت جمع کروائیں ورنہ ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں ہم جو وضاحت بھی داخل کرتے تھے اسے ہمیشہ کہا جاتا تھا کہ یہ تسلی بخش

کا جواب" نوائے وقت سے دلاتی رہی" یا پاکستان ٹیلی ویژن کے تجزیاتی پروگراموں میں جنگ پر الزامات عاید کئے جاتے تھے۔ پھر جب ٹائمز اف انڈیا اور جنگ میں" امن کی آشا" کے لیے اشتراک ہوا یکم جنوری 2009 کو دونوں اخباروں میں ایک ہی اداریہ باہمی مشاورت سے لکھا گیا۔

اداریے کو جنگ کے بانی میر خلیل الرحمان کی زندگی میں بھی ہمیشہ اولیت حاصل رہی۔ سید محمد تقی جیسے دانشور بہت سوچ سمجھ کر اپنے خاص انداز میں اداریے لکھتے تھے۔ بعد میں مختلف اداریہ نویسوں کو میر صاحب خود ہدایت دیتے تھے۔ پاکستان کے اہم تاریخی واقعات پر میر خلیل الرحمان نے خود اداریے لکھے جو مقالہ خصوصی کے طور پر صفحہ اول پر شائع ہوئے۔

اداریہ نویسی ہر اخبار میں صبح سب سے پہلا کام ہوتا تھا۔ پرائیویٹ

''جہان پاکستان'' میں اداریہ صبح نو بجے کے بجائے رات کے نو بجے لکھنے کا فیصلہ

آخر میں یہ عرض ہے کہ ادارت اخبار کی ہو ہفت روزہ کی یا ماہنامہ کی وہ ایک عشق ہے صرف ملازمت نہیں ہے۔ اخبار کو جز وقتی ورکنگ ایڈیٹر نہیں بلکہ ہمہ وقتی ایڈیٹر چاہیے۔ جو تمام ملکی بین الاقوامی علاقائی حالات کا ادراک رکھتا ہو۔ اس ادراک کی روح اداریے کا موضوع ہو اور باقی سارا اخبار بھی اسی نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے۔ اخبار دوسرے شہروں یا دوسرے ملکوں سے ریموٹ کنٹرول سے مرتب نہیں کیے جا سکتے۔ اداریہ ایک اخبار کی پہچان ہے اور اداریے کے بغیر اخبار بے چہرہ انسان کی طرح ہو جاتے ہیں۔

”ایک اخبار سے اداریے کا خاتمہ۔ اُردو صحافت اور ایک مستحکم معاشرے کے لیے بہت خطرناک سانحہ ہے۔ جناب اسرار ایوبی اولڈ ایج بینفٹ کے ادارے سے وابستہ ہے۔ سرکاری اور پرائیوٹ ملازمین کی پنشن اور دوسرے امور کے لیے ہمیشہ جدجہد میں مصروف۔ ان اہم موضوعات پر اخبارات میں ہمیشہ جامع مضامین قلمبند کرتے رہے ہیں۔ اخباری کارکنوں سے ان کا درد بانٹتے رہے ہیں۔ ایک اخبار سے اداریے خاتمہ انہیں بھی بہت فکر مند کر گیا ہے۔ اطراف کی درخواست پر انھوں نے اس پر بہت جامع تحریر سے نوازا ہے۔ ان کا درد محسوس کیجیے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجیے“

اداریہ نویسی ۔۔ جانفشانی ۔ ریاضت کا کام

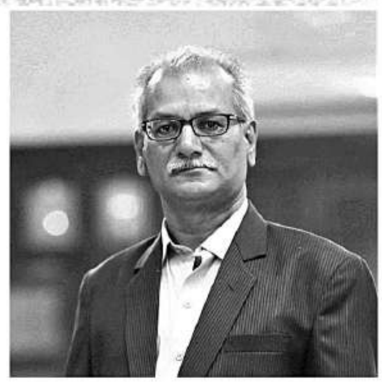

جناب اسرار ایوبی کی اہم تحریر

خبر ہے کہ ملک کے سب سے بڑے اخبار روزنامہ جنگ نے 8 ستمبر سے اچانک اپنے اخبار میں اداریہ نویسی کا سلسلہ ختم کر دیا ہے جس سے صحافتی اور دانشور حلقوں میں تشویش کی شدید لہر دوڑ گئی ہے۔ روزنامہ جنگ کی انتظامیہ کی جانب سے اپنے اخبار میں برصغیر کی صحافت میں گزشتہ دوسو برس سے رائج اداریہ نویسی کی قدیم روایت کو ترک کرنے کے حیرت انگیز اقدام پر مختلف حلقوں کی جانب سے بڑے پیمانے پر تنقید کا سامنا ہے۔ کیونکہ اداریے کو اخبارات کی جان اور روح سمجھا جاتا ہے اور کوئی بھی اخبار اپنے ایڈیٹوریل سیکشن کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں ایڈیٹر اداریہ کے ذریعہ نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے بلکہ بعض موضوعات پر تنقید اور تعریف بھی کرتا ہے۔ اداریئے کسی اخبار کی پالیسیوں کی نا صرف عکاسی کرتے ہیں بلکہ اسے نیوز پبلشنگ ہاؤس کا موقف بھی سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اخبارات میں خبروں کے علاوہ اور بھی مواد ہوتا ہے لیکن اس میں اداریے کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اداریہ کے ذریعہ اخبار کے ایڈیٹر یا اداریہ نویس اظہار خیال کرتے ہیں جس سے اخبار کی پالیسی ظاہر ہوتی ہے۔ اس عمل کو انگریزی زبان میں Editorial یا Lead Editorial کہا جاتا ہے اور اس کے بعد لکھا جانے والے مضمون شذرہ یا Editorial Note کہلاتا ہے۔ اداریہ کو اخبار کا مقالہ افتتاحیہ بھی کہتے ہیں، اخبار کے جس صفحہ پر اداریہ شائع ہوتا ہے اسے اخباری اصطلاح میں ادارتی صفحہ کہتے ہیں۔ جبکہ صحافتی اصطلاح میں اداریہ سے مراد وہ مضمون ہے جو اخبار یا رسالہ کے ادارتی صفحہ پر اخبار کی لوح کے نیچے چھپتا ہے۔ چونکہ اخبار میں شائع شدہ 80 فیصد سے زائد خبروں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا کسی اخبار کا ادارتی صفحہ ہی اس کی پالیسی متعارف کراتا ہے اور مختلف اخبارات کو جو امر ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا کرتا ہے وہ اس اخبار کا ادارتی صفحہ ہی ہوتا ہے۔ اخبارات میں اداریہ نویسی کا مقصد قوم کو درپیش اہم مسائل کی تشریح، ترقی پسند رجحانات کے فروغ، رائے عامہ کی تشکیل اور ایک بہتر سماج کی تعمیر وترقی کے لئے عوام الناس کو غور و فکر کی دعوت دینا ہے۔ اداریہ نویسی ایک نہایت ہی مشکل، بڑی جانفشانی اور ریاضت والا کام ہے۔ اس میں ایک اداریہ نگار کو حالات اور واقعات کا مکمل جائزہ لے کر کسی بھی موضوع پر اداریہ قلمبند کرنا ہوتا ہے۔ وہ حالات واقعات کی ایسی منطقی تصویر کشی کرتا ہے کہ دانشور طبقہ اور قارئین میں غور وفکر کی عادت پڑے اور معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی رونما ہو۔ حالات حاضرہ کو سمجھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کے لیے ایک اداریہ نگار کے لئے وسیع المطالعہ، باشعور اور بالغ نظر ہونا بیحد ضروری ہے۔ اداریہ میں دی جانے والی رائے سے حکومت اور عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے کہ ملک یا سماج کے لئے کون سی باتیں مفید یا غیر مفید ہیں ان پر ایک اداریہ نگار کو جواں مردی سے مذمت اور کھل کر تنقید کرنی چاہئے۔ برصغیر میں 1822 میں جاری ہونے والے اخبارات جام جہاں نما اور آگرہ اخبار نے اردو صحافت میں اداریہ نویسی کی بنیاد ڈالی۔ اردو صحافت میں اداریہ نگاری کا سب سے اہم اور زریں دور 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ 1858 میں منشی نول کشور کے جاری کردہ 'اودھ اخبار' میں اداریوں کو نمایاں جگہ دی گئی۔ اس اخبار کے ساتھ مختلف نامور اہل قلم کی وابستگی رہی جن کی علمی اور ادبی صلاحیتوں نے اس اخبار کے معیار کو ہمیشہ قائم رکھا۔ سماجی برائیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو اس اخبار نے طنز کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد اداریہ نویسی میں جو نام سب سے زیادہ اہم ہے وہ سر سید احمد خان کا ہے۔ 1837 میں سر سید کے بھائی سید محمد خان نے 'سیدالاخبار' جاری کیا، اسی اخبار سے سرسید نے اپنی علمی وادبی زندگی کا آغاز کیا۔ علوم و فنون کو فروغ دینے کے لئے سرسید نے 1863 میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ 1866 میں سرسید نے اس سوسائٹی سے ایک اخبار بھی جاری کیا جس کا نام 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی' تھا۔ اس اخبار سے قبل اردو اخبارات میں اداریہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، اس اخبار نے

مولانا حسرت موہانی

سرسیّد احمد خان نے مسلمانوں کو اپنے اداریوں سے ہی جگایا

اسے عام کیا۔ اخبار نے جہاں ایک طرف ہندوستانیوں کو مغربی علوم وفنون سے روشناس کرایا تو دوسری طرف اردو زبان وادب کو آسان اور عام فہم بنانے میں بھی کلیدی رول ادا کیا۔ اس کے بعد سرسید نے 1870 میں رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کا مقصد سماجی اصلاح تھا۔ انہوں نے یہ رسالہ انگلستان سے واپس آکر وہاں کے

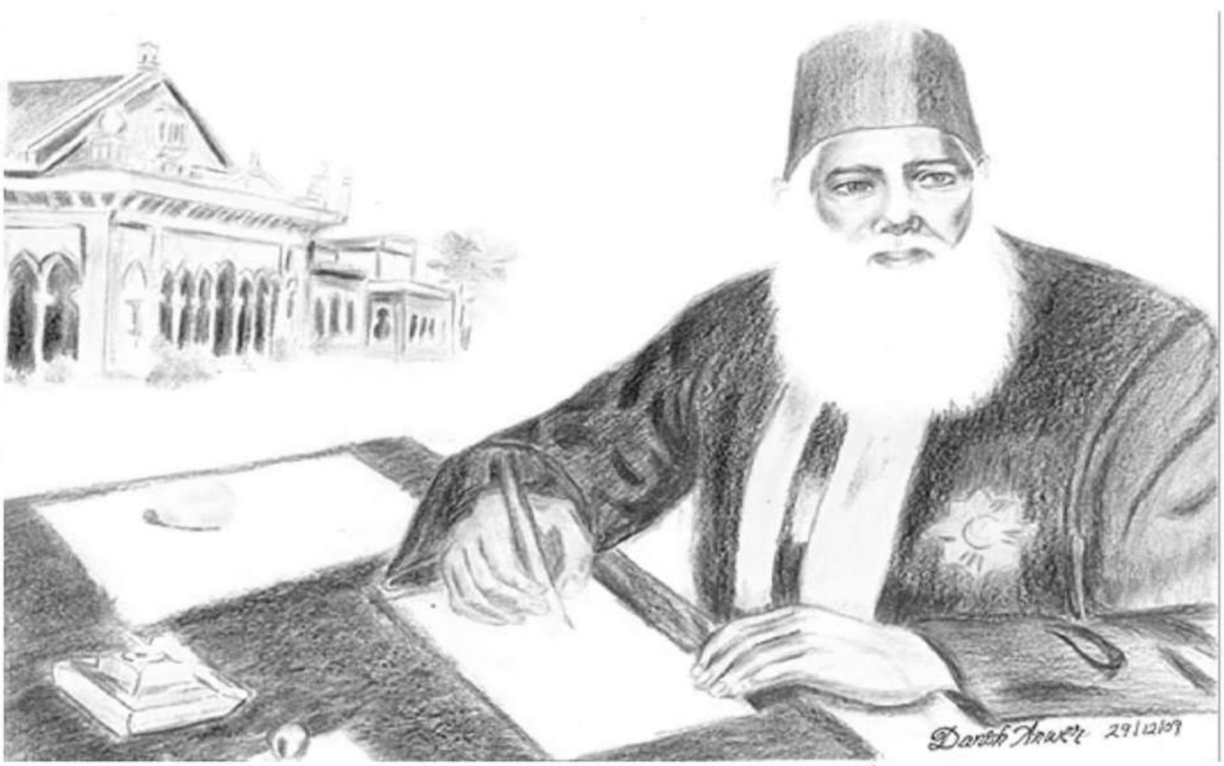

دو جرائد دی ٹیٹلر (TheTatler) اور دی سپکٹیٹر (The Spectator) کے نمونے پر جاری کیا تھا۔ اس میں تحریر کئے گئے اداریوں کے ذریعہ سرسید نے مسلمانوں کو جدید تہذیب سے روشناس کرایا تاکہ وہ ایک تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ قوم بن سکیں۔ سرسید کے قلم سے لکھے گئے اداریوں سے معاشرے میں اصلاح پیدا ہوئی اور قوم کے ہر فرد کو اپنی ذمے داری کا احساس ہوا۔ انہوں نے شعبہ صحافت کو اداریہ نویسی کی ایک نئی سمت دی جس کی پیروی کرتے ہوئے بعد کے صحافیوں نے اداریہ نویسی کو فروغ دیا۔ بلاشبہ صحافت کے اس دور کا امام سرسید ہی کو تصور کیا جاتا ہے۔

سرسید کے بعد حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر اور ابو الکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اپنے زمانے کے بلند پایہ صحافی، مقرر، خطیب، ادیب، شاعر اور سیاستداں تھے جن کے قلمبند اداریوں کی مقبولیت آج بھی اردو صحافت میں برقرار ہے۔ 1903 میں مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے رسالہ 'اردوئے معلیٰ' جاری کیا۔ یہ محض علمی وادبی رسالہ نہیں تھا بلکہ اس میں سیاسی موضوعات پر بھی تند وتیز تحریریں اور شذرات بھی شامل ہوتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ حسرت موہانی نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور اپنی بلند پایہ صحافیانہ تحریروں سے آزادی کامل کا نعرہ بلند کیا۔ 1903 میں ہی مولوی سراج الدین نے کسانوں اور زمینداروں کی فلاح وبہبود کے لئے 'زمیندار' اخبار جاری کیا۔ 1910 میں مولوی سراج الدین کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے بارے میں خبروں اور مولانا ظفر کے لکھے گئے بیباک اداریوں نے اس اخبار کو عوام کا مقبول ترین اخبار بنا دیا تھا۔ اس اخبار کے ادارتی عملے میں نیاز فتح پوری، عبداللہ عمادی، وحیدالدین سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جیسی علمی وادبی شخصیات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ اس اخبار نے تحریک آزادی ہند میں بھی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ 13 جولائی 1912 کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار اخبار 'الہلال' جاری کیا تو اردو صحافت نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ مولانا آزاد بیک وقت صحافی، انشاپرداز، ادیب، سیاستدان، عالم اور محب وطن تھے جس کی زندہ مثالیں ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ الہلال میں مولانا آزاد نے مذہب کے علاوہ سیاست، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ، عمرانیات اور حالاتِ حاضرہ کے مسائل پر بھی لکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان کو یہ بتایا کہ وہ عملی طور پر قومی سیاست میں حصہ لیں۔ الہلال نے اپنے اداریوں میں ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے 1915 میں 'البلاغ' جاری کیا جو الہلال کا دوسرا حصہ تھا۔ بجنور سے محمد مجید حسن نے 'مدینہ' نام کا ایک اخبار نکالا جس نے انگریزی حکومت کی زیادتیوں کو اپنے اداریوں میں کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس اخبار میں اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر لکھتے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ محمد علی جوہر کے مشہور اخبار 'ہمدرد' کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ 1913 کو جب دہلی سے اس اخبار کا اجرا ہوا یہ دور ملک میں سیاسی افراتفری کا تھا اس دور میں ہمدرد نے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا۔ ہمدرد کا بنیادی مقصد انگریز حکومت کی مخالفت، ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد تھا۔ محمد علی جوہر نے اپنے اخبارات کے اداریوں کے ذریعے عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا، ملک میں ہونے والی فرقہ وارانہ کشیدگی اور فساد سے لوگوں کو روشناس کرایا جس سے انتشار پیدا ہونے کا خدشہ ہو۔ جب ہم صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے اخبارات بطور خاص کسی خاص طبقے میں مقبول ہوتے نظر آتے ہیں جو غیر معمولی ذہانت اور اپنے منفرد انداز نگارش کے مالک ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں دہلی اردو اخبار، اس کے بعد تہذیب الاخلاق بعد میں زمیندار، الہلال اور علی گڑھ گزٹ اور اسی طرح کے دیگر اخبارات میں الجمعیت اور مدینہ بجنور جیسے اخبارات بھی اپنے مدیروں کی وجہ سے زیادہ پسند کئے گئے اور ان سے وابستگی خود ان کے مدیروں کے لئے بھی وجہ شہرت و افتخار بنی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' یا بعد میں 'البلاغ' اور مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' اسی دائرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے فکر انگیز اداریوں کو کون نظر انداز کرسکتا ہے۔ ان ارباب صحافت کے وسیلے سے ہماری صحافت کی ایک ادبی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی تاریخ بن گئی۔ اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے

آتی ہے کہ ماضی میں ان صحافیوں نے اپنے اخبارات ورسائل کے

اداریے کو عام، قارئین کم لیکن دانشور ضرور پڑھتے ہیں

اداریوں کے سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور عوام میں علمی وادبی ذوق پیدا کیا۔

اداریہ ایک مضمون یا کوئی تحریری دستاویز ہوتا ہے جو اکثر بغیر دستخط کے شائع کیا جاتا ہے اور اسے اخبار یا رسالے کے سینئر ادارتی افراد یا پبلشر لکھتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی خاص موضوع یا مسئلے پر اشاعت کی رائے کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ گوکہ اداریہ کو قارئین کی کم تعداد پڑھتی ہے لیکن اسے دانشور اور اشرافیہ طبقہ ضرور پڑھتا ہے۔ اداریہ کسی اخبار کا وہ حصہ ہے جہاں اخبار اپنے خیالات اور موجودہ مسائل پر تبصرہ پیش کرسکتا ہے۔ اسے ایڈیٹر اور قارئین کے درمیان ایک منفرد اندازِ گفتگو بھی کہا جاتا ہے۔ اخبارات میں اداریہ نویسی کو خاص اہمیت حاصل ہے جو کسی بھی سنجیدہ اور غیر دلچسپ موضوع کو مباحثے کے قابل بنا دیتا ہے۔ یہ عوام الناس کی سوچ کو اُبھارتے ہیں اور قارئین کے ذہنوں میں سوالات پیدا کرتے ہیں۔ اخباری اداریوں کو متاثر کن اور حوصلہ افزا عمل بھی سمجھا جاسکتا ہے یہ اخبار کی اقدار اور پالیسیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ان مضامین میں غیر جانبداری برقرار رکھی جائے۔ اگر ایڈیٹر سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو پورے اخبار کو جواب دہ ہونا پڑسکتا ہے۔ اداریوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں، جن میں تشریحی اداریہ، اس میں یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ کسی خبر یا موجودہ مسئلے میں کیا چیز اہم ہے۔ اس میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں جیسے خبر کے مرکزی کردار، عوامل، کئے گئے اقدامات اور دیگر اہم تفصیلات وغیرہ لیکن اس میں ذاتی رائے شامل نہیں ہوتی۔ تنقیدی اداریہ، یہ انداز اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی خبر یا واقعے کی مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو ایڈیٹر کی نظر سے دیکھنا ہو۔ ایڈیٹر ایسے اداریوں کے ذریعہ لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعض اوقات آخر میں حل بھی پیش کرتا ہے۔ تعریفی اداریوں میں اُن لوگوں کی تعریف یا ستائش کی جاتی ہے جنہوں نے اپنے کام میں بہترین کارکردگی دکھائی ہو اور جو تعریف کے مستحق ہوں۔ جبکہ تفریحی اداریوں میں ایسے موضوعات شامل کئے جاتے ہیں جو نوجوانوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔ اخباری اداریے کسی بھی معاشرہ میں بیحد اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ موجودہ حالات اور پالیسی مباحثوں پر اخبار کا موقف پیش کرکے عوامی رائے کو آگاہ اور متاثر کرتے ہیں اور عوامی سطح پر ایک آزاد سیاسی آواز کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اداریے عوامی مکالمے کی رہنمائی کرتے ہیں، سیاسی رہنماؤں اور پالیسی سازوں کو متاثر کرتے ہیں اور عوامی مسائل پر ایک منظم نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جس سے قارئین کو پیچیدہ موضوعات کو سمجھنے اور اپنی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اخبارات کے اداریے ایک قسم کی آزاد سیاسی آواز اور فکر ہوتے ہیں جو اخبارات کو فعال سیاسی کردار ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں، جو اپنے سیاسی مقاصد اور مفادات کو مؤثر مواد کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ اخبارات کے ادارتی بورڈ اخبار کے ایجنڈے کی تشکیل دیتے ہیں اور اپنے اجلاسوں میں بحث ومباحثہ کے ذریعہ منتخب موضوعات طے کرتے ہیں کہ اداریوں میں کن مسائل پر بات ہوگی اور انہیں باقی مواد میں کس انداز سے پیش کیا جائے گا۔ اخبارات کے ایڈیٹرز کے خیالات سیاسی اشرافیہ اور پالیسی سازوں کی توجہ حاصل کرسکتے ہیں اور یہ خیالات وسیع تر عوامی مباحثے میں حصہ بنتے ہیں۔ عام خبروں

اخبارات کے ادارتی بورڈ اخبار کا ایجنڈا تشکیل دیتے ہیں

کے برعکس جو صرف معلومات پر مشتمل ہوتی ہیں، اداریے حالات و واقعات کا عمیق تجزیہ کرتے ہیں اور ان امور کا ایک تشریحی اور تجزیاتی نقطہ نظر فراہم کرتے ہیں، جو قارئین کے لئے قیمتی معلومات مہیا کرتا ہے۔ اخبارات اپنے اداریوں کے ذریعہ اہم قومی مسائل پر واضح مؤقف اختیار کرکے اپنے قارئین کو ان موضوعات سے جڑنے اور عوامی بحث ومباحثے اور مکالمے کے رجحان کو فروغ دیتے

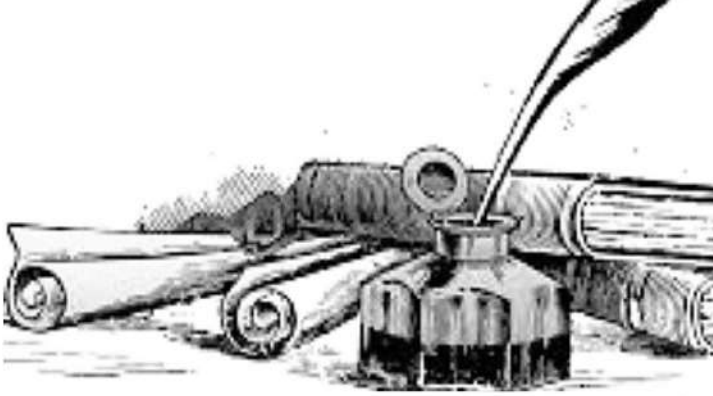

ہیں۔ ایسے میں روزنامہ جنگ سے روایتی اداریہ نویسی کا خاتمہ ملک کے باشعور طبقہ کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ ❁

ماہنامہ اطراف ''اخباری اداریہ نمبر'' کے لیے ہم نے جناب اشفاق بدایونی کو بھی زحمت دی۔ اُن کی مختصر سی تحریر سعودی اخبارات کے بارے میں بہت کچھ بتا رہی ہے۔ اداریے وہاں بھی اب اخبارات کی زینت نہیں ہوتے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں اشفاق صاحب کی تحریر سعودی اخباری منظر نامہ آپ کے سامنے لا رہی ہے۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔

اخبار کے دامن میں کوئی اداریہ کیوں نہیں

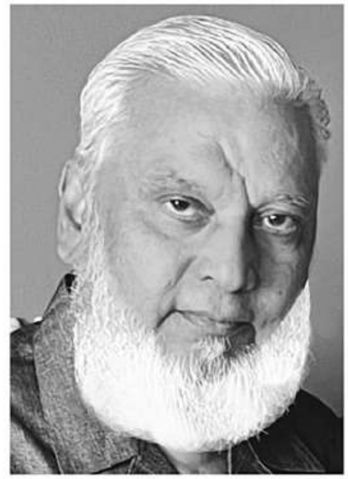

تحریر: محمد اشفاق بدایونی (جدہ)

جب چائے پینے کے دوران میں نے انگریزی اخبار"عرب نیوز" کے ایڈیٹر سے اخباری"اداریہ" کے متعلق بات کی تو"روزنامہ عرب نیوز" جو سعودی عرب کا ایک معتبر اخبار ہے اسکے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن کی حیثیت میں ہم سے کہا کہ اشفاق صاحب آج جب آپ اخبار کے دفتر آ ہی گئے ہیں تو کیوں نا کچھ دیر بیٹھ کر باتیں ہی کرتے ہیں کچھ آپ اپنی اور اپنے ملک کی سنائیں اور ہم اپنی اور اپنے ملک کی سنائیں (بہ لحاظِ تو طن انکا تعلق ہندوستان سے ہے) اور پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولے کہ پھر دونوں اس ملک کی بات

اُردو نیوز 1996 میں شروع، 2019 میں بند

کریں جہاں سیاسی باتیں کرنا منع ہے اور جہاں بادشاہت اور رعایا باہم ہمکلام نہیں ہوتے شاہی احکامات آتے ہیں اور رعایا کا کام بس تعمیل کرنا ہوتا ہے ہم نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا کہ اخبارات کے دامن میں آجکل کوئی اداریہ کیوں نظر نہیں آرہا ہے۔

ایڈیٹر نے جواباً کہا کہ آپ اس کیوں کے جواب میں یہ کہانی سن لیجئے ایک بادشاہ اپنے ملک کے بندروں سے بہت خائف تھا مگر چونکہ بادشاہ تھا اس لیئے اُسکا حکم حرفِ آخر مانا جاتا تھا ایک دن اس نے ایک لوہے کا مضبوط پنجرہ بنوایا جسکو متوازن رکھنے کے لیئے آٹھ بندروں سے زیادہ کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی بادشاہ نے سارے سرکردہ بندروں کو بلوایا اور اس میں سے آٹھ بے قابو بندروں کو پنجرے میں بند کروادیا اور پنجرے کی چھت پر بہت سارے کیلے رکھدیے جیسے ہی بندر کیلوں پر جھپٹے اوپر سے ناقابلِ برداشت برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی بندروں پر گرا تو بندر کیلے چھوڑ کر ایک کونے میں دُبک کر بیٹھ گئے یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا پھر دو بندروں نے چیخ و پکار مچائی تو بادشاہ کے آدمیوں نے اُن دو بندروں کو کہیں غائب کروادیا اور دو نئے بندر پنجرے میں ڈال دیئے تاکہ پنجرے کا توازن برقرار رہے پھر کچھ دن بعد دو اور بندروں نے چیخ پکار کی انکو بھی پنجرے سے نکال کر غائب کردیا اب خوف و ہراس بہت بڑھ گیا تھا کوئی کسی سے بات نہیں کررہا تھا نئے بندر یہ خاموشی اور خوف دیکھ کر کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ پارہے تھے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کیا ہوا ہے بس سب چپ تھے اور ڈرے ہوئے تھے کہ اسی دوران پھر خبر ملی کہ پرانے چار بندر کچھ سازش کررہے تھے تو ان چار کو بھی باہر نکال کر غائب کردیا گیا اور چار نئے سیدھے سادھے بندر لاکر پنجرے میں بند کردیئے گئے اب ان آٹھ بندروں کو یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ مسئلہ کیا تھا بس وہ دُم دبائے خاموش بے خبر اور سہمے ہوئے اپنا وقت گزار رہے تھے۔

ایڈیٹر نے کہانی ختم کرتے ہوئے کہا کہ ہم نئے بندر ہیں۔

سعودیہ کا اردو اخبار"اردو نیوز ۱۹۹۴ میں شائع ہونا شروع ہوا اور ۲۰۱۹ میں بند کردیا گیا اسکی وجہ بھی بندروں والی لگتی ہے۔

جبکہ عرب نیوز جو انگریزی کا اخبار ہے اس میں اداریہ ۲۰۱٦ میں بند کردیا گیا تھا اداریہ بند ہونے کی وجہ اُن آٹھ بندروں کے غائب ہونے کے ساتھ ہی غائب ہوگئی۔

بادشاہت میں رعایا کو حقِ رائے دہی کی اصطلاح کو صرف لغات کی زینت بنانے کی اجازت ہوتی

انتہا تو یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ امام مسجد اپنی مرضی سے نہیں دے سکتا کیونکہ وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے لکھا ہوا خطبہ آئمہ مساجد کو دیا جاتا ہے اور پوری مملکت میں وہی خطبہ پڑھا جاتا ہے تو بے چارہ اداریہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

خطبہ بھی سرکاری پڑھا جاتا ہے اداریے کی کیا اہمیت

اداریے سے قطع نظر ایڈیٹر کے نام نامے نہ آنے کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ وہ بے چارہ کر کیا لیگا اخبار میں تو وہ چھاپ نہیں سکتا بس یہ سوچ سوچ کر کُڑھتا رہتا تھا کہ:-

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہی"

بس اداریوں کی اوقات یہ تھی کہ سلطنت جس بات کی تشہیر چاہتی اسکو

اداریے کے جامے میں ملبوس کرکے چھاپ دیا جاتا اور کالم اس احتیاط سے لکھے جاتے تھے کہ کہیں ایسا نہ کہ کالم چھپے اور ہم غائب۔ اس لیئے کالمی مزاج یہ بن گیا تھا کہ من تراحاجی بگویم تو مراملاّ بگو۔

صحافت کی تدریسی کتب کیا کہتی ہیں یہ میرے مطالعے میں نہیں لیکن میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ اخبار میں خبروں کی حیثیت اور اہمیت کچھ یوں ہوتی ہے۔

عرب نیوز میں اداریہ 2016 میں بند کردیا تھا

۱-اطلاع:- یہ عام سی بات تحریری یا تصویری شکل میں ہوسکتی ہے

۲-خبر:- ایک نئی بات جس کا ابلاغ ہر فرد تک ہونا ناگزیر ہوتا ہے

۳-کالم:- سماج میں موجود صاحبان الرائے مختلف موضوعات پر گفتگو کرکے حاکمانِ وقت کی اصلاح اور رہنمائی کے لیئے ایک چشم کشا مضمون تحریر کرتے ہیں۔

۴-اداریہ:- اخبار کا ایک ادارتی بورڈ ہوتا ہے جس میں انتہائی تجربہ کار معاملہ فہم اور باخبر صحافی متفقہ طور کسی ایک مسئلہ پر چاہے وہ داخلی ہو یا خارجی، قومی ہو یا بین الاقوامی اس پر اپنی رائے تحریر کیا کرتے ہیں اس اداریے کا مقصد مستقبل میں پیدا ہونے والے کسی ممکنہ بگاڑ کے لیئے قبل از وقت سد باب کی خاطر صاحبانِ اختیار کی توجہ مبذول کروانا ہوتا ہے۔

اور بادشاہتیں یہ سب کچھ گوارا نہیں کرتیں اسی لیئے اخبارات اطلاعات کا مرقع بن کے رہ جاتے ہیں۔

پھر قاری یوں گنگنا اُٹھتا ہے کہ:

جو دل کو ہے خبر کہیں ملتی نہیں خبر
ہر صبح اک عذاب ہے اخبار دیکھنا"

ماہنامہ اطراف کے "اخباری اداریہ نمبر" کے لیے ہم نے اطراف کی اعتراف خدمت اعزا یافتہ ہما بیگ صاحبہ سے کی گزارش کی تھی۔ افسانہ نگار ہما بیگ صاحب مطالعہ ہیں اخبار رسالے کتابیں خرید کر پڑھتی ہیں۔ ماہنامہ اطراف کی ابتدا سے قلمی سرپرستی کررہی ہیں۔ ان کی تحریر پڑھیئے اور اپنے تاثرات سے آگاہ کیجئے۔

اداریے کا خاتمہ میرے جیسے روایت سے جڑے لوگوں کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں

افسانہ نگار ہما بیگ کے تاثرات

"اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

یہ مصرع رئیس امروہوی مرحوم کی شہرۂ آفاق نظم کا ہے جو انہوں نے 1952 میں بنگلہ زبان کو قومی زبان کا درجہ ملنے پر 7 مارچ 1952 کو جنگ اخبار میں شائع کی، ایک وقت تھا جب رئیس امروہوی اور جنگ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تصور کیئے جاتے تھے، رئیس امروہوی کے انتقال کے بعد جنگ اخبار کی سانسیں بھی اکھڑنا شروع

جنگ صرف ایک اخبار نہیں ایک یونیورسٹی

ہوگئی تھیں، لیکن جیسے تیسے اخبار اور اس کے ذیلی رسالے چلتے رہے پھر ٹی وی چینلز کا دور شروع ہوا جو پرنٹ میڈیا کے لیے کسی زلزلے سے کم نہ تھا، لیکن جنگ گروپ اور جنگ اخبار جو اس ملک کا سب سے بڑا گروپ اور اخبار تھا اس نے اس جھٹکے کو بھی برداشت کرلیا اور بدلتے وقت کے ساتھ اس نے بھی اپنا کاروبار پرنٹ سے الیکٹرونک میڈیا میں منتقل کرنا شروع کردیا اور بہت جلد جیو ٹی وی جو جنگ گروپ کا برقی چہرہ تھا بھرپور طور پر چمکنے لگا۔

لیکن اس کی قیمت پرنٹ میڈیا اور اخبارات سے منسلک لوگوں اور خصوصاً اخبارات کے شائقین کو ادا کرنا پڑی، ان متاثرین میں میں خود بھی شامل ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر کی طرح اکثر گھروں میں جب تک جنگ اور ڈان اخبار نہ پہنچے صبح کا تصور نہ ہوتا۔ بات ہو رہی ہے اردو کے حوالے سے تو جنگ اخبار کی نمایاں خصوصیات جن میں رئیس امروہوی کا قطعہ اپنے آپ میں مکمل خبر ہوتی، بلکہ یہ کہا جائے کہ رئیس امروہوی کا چار مصرعوں پر مشتمل قطعہ خود ایک اخبار تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

جنگ کی دوسری بڑی خصوصیت اس کا اداریہ تھا جسے بڑے اہتمام سے اور کڑی چھان پھٹک کر تیار کیا جاتا، اس اداریے میں اہم ترین سیاسی، علاقائی، بین الاقوامی نوعیت کے اہم مسائل اور موضوعات پر روشنی ڈالی جاتی، جو نہ صرف لوگوں میں آگاہی پیدا کرتی بلکہ کہیں نہ کہیں ملکی پالیسی پر بھی کچھ نہ کچھ اثر انداز ہوتا۔

اس اداریے سے صحافتی دنیا کے بڑے بڑے نام منسوب رہے ہیں، لیکن حال ہی میں پتہ چلا کہ اب یہ سلسلہ بھی ختم کردیا گیا جو میرے جیسے روایت سے جڑے لوگوں کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں، جیسا کہ میں نے شروع میں رئیس امروہوی مرحوم کی نظم "اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" کا ذکر کیا تو اب لگتا ہے کہ جنگ اخبار کے اداریے کے بند ہونے کے بعد اس کی تدفین کا وقت ہوا چاہتا ہے

جنگ اخبار صرف ایک اخبار نہیں بلکہ ایک عہد تھا جو تمام ہوا چاہتا ہے، یہ ایک اخبار کی موت نہیں بلکہ اخبار بینی کی بھی موت ہے جنگ اور اس جیسے اخبارات نہ صرف خبروں کا ذریعہ تھے بلکہ یہ اپنے آپ میں ایک یونیورسٹی بھی تھے جب تک لوگوں میں اخبار بینی باقی رہی لوگوں میں معیاری اردو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کی صلاحیت بھی باقی رہی۔

جب سے ریڈیو اور اخبارات کا زوال شروع ہوا ہے لوگوں کا معیار گفتگو اور ذخیرہ معلومات محدود سے محدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بظاہر سوشل میڈیا پر خبروں کا طوفان ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا، لیکن ان خبروں کی زندگی بھی بہت محدود ہے، کوئی نہیں جانتا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، کس پر بھروسہ کیا جائے اور کس پر نہیں۔ نتیجہ ایک کنفوژ قوم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

آج جس طرح کی اردو الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر بولی اور لکھی جا رہی ہے لگتا ہے کہ کوئی کا اردو سے انتقام لے رہا ہو جیسے، ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے محدود نظر سے دیکھیں کہ کوئی بات نہیں، اردو زبان مرتی ہے تو مرے، ہماری زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع تو ملے گا، تو یہ ان کی بھول ہے، جو نظر وسیع رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اردو کی موت صرف اردو کی موت نہیں ہے بلکہ ہر علاقائی زبان کی موت ہوگی اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا اور وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں۔

مغرب اپنی تمام تر ترقی کے باوجود اپنی روایتوں سے جڑا ہے لوگوں میں کتابیں، رسائل اور اخبارات پڑھنے کا رواج جوں کا توں ہے ان کے اخبارات قابل بھروسہ خبروں کے لیے جانے جاتے ہیں اور کسی بھی اخبار کا اداریہ یا خصوصی کالم بہت اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ آج بھی اخبارات ہی کسی بھی اسٹوری کو "بریک" کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تصور کیئے جاتے ہیں۔

کسی بھی قوم کی ذہن سازی میں کتابیں، رسائل اور اخبارات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ایسے میں ہمارے ہاں پرنٹ میڈیا کی تباہی علم کے صحت مند پھیلاؤ میں بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے، اس لیے مقتدر اداروں کو اپنی ترجیحات کو ازسرنو ترتیب دینے کی ضرورت ہے ایک صحت مند معاشرہ صحتمند ذہن سے بنتا ہے اور صحتمند ذہن کو معیاری، مستند، اور دیرپا معلومات کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف پرنٹ میڈیا

سوشل میڈیا ذخیرہ معلومات محدود کررہا ہے

ہی فراہم کرسکتا ہے، جبکہ الیکٹرونک میڈیا بہت تیزی سے بدلتا ہے بیک وقت مختلف اور متضاد خبروں اور معلومات انسانی ذہن کی یکسوئی ختم کردیتا ہے ایسی لیے آج ہر ٹی وی دیکھنے والے کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول ہوتا ہے جسے وہ مسلسل تبدیل کرتا رہا ہے ایسے میں معیاری، مستند، اور دیرپا معلومات کیسے مل سکتی ہیں؟

قدسیہ ملک۔ جناح یونیورسٹی میڈیا سائنسز سے وابستہ ہیں ماہنامہ اطراف کے مضمون نویسی کے مقابلوں میں انعامات کی حقدار بھی قرار پائیں۔جیل میں خواتین کے مسائل پر ایک کتابچہ بھی تحریر کرچکی ہیں۔ ماہنامہ اطراف اخباری اداریہ نمبر کے لیے انتہائی اہم نکات پر مبنی ایک تحریر سے نواز رہی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

قیام پاکستان کے بعد استحکامِ پاکستان کے لیے اخباری اداریوں کا کردار

تحریر: قدسیہ ملک

اردیہ کے سب سے بڑے اخبار جنگ کا آٹھ ستمبر سے بغیر اداریے چھپنا واقعی ایک اہم صحافتی مسئلہ ہے۔ اداریہ اخبارات کی آواز ہوتا ہے جو عوام، سیاست اور سماج کے اہم مسائل پر سوچ بچار اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ماہنامہ اطراف کا اکتوبر کا شمارہ اردو اخبارات میں اداریہ" کی روشنی میں ایک فکری کوشش ہے جو قارئین اور صحافت دونوں کے لیے ہونے والے نقصان دہ اثرات کے لئے باعث تشویش ہے۔

اداریے کی غیر موجودگی سے قاری کو تجزیہ، بصیرت اور قومی و عالمی معاملات پر گہرائی سے سوچنے کا موقع نہیں ملتا، اوراس سے اخبار کی صحافتی ذمہ داری متاثر ہوتی ہے۔ اردو صحافت کو مضبوط بنانے کے لیے اداریوں کا مستقل اور معیار کے ساتھ ہونا ضروری ہے تا کہ وہ ایک مستقل صحافتی فورم قائم رکھ سکے۔

اداریوں میں تعلیم، معاشی خودمختاری، اور قومی دفاع پر زور دیا گیا

قیام پاکستان کے بعد ملک کو استحکام دینا اور اسے مضبوط کرنا ضروری تھا کیونکہ نئے ملک کو سیاسی، اقتصادی، اور سماجی چیلنجز کا سامنا تھا۔ مختلف اخبارات اور مدنظر شعبوں میں اس موضوع پر اداریے لکھے گئے، جن میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. ملکی یکجہتی اور اتحاد: اداریوں میں بارہا زور دیا گیا کہ ملک کو مختلف لسانی، مذہبی اور ثقافتی فرقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ہوگا تا کہ دشمنان پاکستان کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکے۔ اتحاد کو قومی طاقت کا محور قرار دیا گیا۔

2. تعلیم اور شعور کی فراہمی: پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے تعلیم کو بنیاد بنایا گیا۔ اداریوں میں کہا گیا کہ تعلیمی اداروں کو بہتر بنا کر نئی نسل کو قومی ذمہ داریوں کا شعور دینا ہوگا۔

3. معاشی خودمختاری: مختلف ادارتی تحریروں میں پاکستان کی اقتصادی ترقی پر زور دیا گیا کہ زراعت، صنعت، اور تجارت کو فروغ دیا جائے تا کہ ملک خود کفیل بن سکے۔

4. قومی دفاع مضبوط کرنا: استحکام کے لیے فوجی اور دفاعی نظام کو مضبوط بنانے کی ضرورت پر بھی اداریوں میں تاکید کی گئی تا کہ ملک کی سلامتی یقینی بن سکے۔

5. جمہوری اداروں کی مضبوطی: اداریوں نے جمہوری نظام کو مضبوط کرنے اور قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنے پر زور دیا تا کہ معاشرتی انصاف اور سیاسی استحکام حاصل ہو۔

6. بین الاقوامی تعلقات: پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر پہچان اور تعلقات بہتر بنانے کی ضرورت کا بھی اداریوں میں ذکر رہا، خاص طور پر برصغیر کی پیچیدہ صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

مجموعی طور پر یہ اداریے پاکستانی قوم کو متحد کرنے، خوداعتمادی پیدا کرنے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بین الاقوامی تعلقات پر اداریوں میں خاص توجہ دی گئی کہ نئے ملک کو عالمی سطح پر مستحکم اور تسلیم شدہ بنانا ضروری ہے۔

1. اداریے زور دیتے ہیں کہ پاکستان کو دنیا کے بڑے طاقت ور ممالک کے ساتھ دوستانہ اور مثبت تعلقات قائم کرنے چاہئیں تا کہ سیاسی اور معاشی تعاون میں اضافہ ہو۔

2. خاص طور پر پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی بہت نزاکت پر روشنی ڈالی گئی تا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے ذریعے خطے میں امن ممکن ہو۔

3. اداریوں میں بین الاقوامی برادری سے بہتر رابطے، سفارتی اقدامات اور اقوام متحدہ جیسے اداروں میں پاکستان کی مضبوط نمائندگی پر بھی زور دیا گیا۔

4. اقتصادی ترقی کے لیے بیرون ملک سرمایہ کاری اور امداد کے مواقع پیدا کرنے پر غور کیا گیا تا کہ ملک کی معیشت کو تابناک بنایا جاسکے۔

5. عالمی مسائل میں پاکستان کی ایک مؤثر آواز بنانے اور اپنی خود مختاری کا تحفظ کرنے کی ضرورت اجاگر کی گئی۔

جمہوری اداروں کی مضبوطی اور موثر خارجہ پالیسی بھی اہم نکات رہے

یہ تمام نکات اس بات کا عکاس ہیں کہ ابتدائی دور میں پاکستان کی بین الاقوامی پالیسیاں ملک کی سلامتی، ترقی اور عالمی مقام کے لیے کتنی اہم تھیں۔ ۞

جناب مقبول خان۔ پاکستان کے سنیئر صحافیوں میں سے ہیں۔ کئی اہم قومی روزناموں سے وابستہ رہے ہیں۔ اطراف کی فرمائش پر وہ بھی اپنی طویل صحافتی ریاضت، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اس سانحے پر اپنے تاثرات کا اظہار ایک مبسوط اور مدلل تحریر میں کررہے ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

اداریے عوام کی رہنمائی کا سرچشمہ

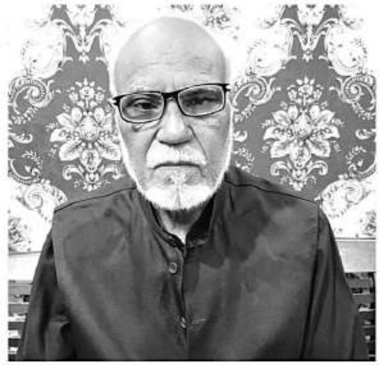

سنیئر صحافی مقبول خان کی تحریر

اردو کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ نے 8 ستمبر سے اداریے کے بغیر اشاعت شروع کر دی ہے۔ جناب محمود شام کے بقول اداریے کے بغیر اخبار کی اشاعت ایک اہم صحافتی معاملہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی سوشل میڈیا پر شام جی کا اس حوالہ سے ایک نوحہ ایک الوداعیہ بھی نظر سے گذرا جس کا پہلا مصرع۔

خبر تو جا ہی چکی تھی

اداریہ بھی گیا

یہ نوحہ اور الوداعیہ C صحافت سے وابستگان سمیت اداریہ پڑھنے والے قارئین کو بھی دعوت فکر ونظر دے رہا ہے۔ پاکستان میں اداریے کے بغیر اخبار کی اشاعت اس حوالے سے ایک صحافتی معاملہ ضرور ہے لیکن یہ صحافتی قدیم روایت اور صحافتی فلاسفی تبدیل کرنے کی جانب پہلا قدم بھی ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ اب دیگر اخبارات میں بھی اداریے کے بغیر اشاعت کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار میں ایڈیٹر کا منصب بھی بے مصرف ہو کر رہ جائے گا۔ اس وقت پاکستان میں اردو کے دو بڑے اخبار ایڈیٹر کے بغیر ہی شائع ہورہے ہیں۔ اب جن اخبارات میں برائے نام ایڈیٹر ہیں، وہ بھی فارغ کئے جاسکتے ہیں۔ پاکستان میں روزنامہ جنگ سے اداریے کی اشاعت کا خاتمہ اگرچہ پہلا واقعہ ہے، لیکن مغربی ممالک میں بھی اداریے کے بغیر اشاعت کا چلن عام ہونا پہلے ہی شروع ہوچکا ہے۔ گارڈئین اور یو ایس ٹوڈے نے اپنے اداریے مختصر کر دئے ہیں، جبکہ نیو یارک ٹائمز نے اپنے ادارتی صفحات پر اداریہ کی اشاعت مستقل طور پر بند کردی ہے۔

اردو صحافت میں اگر اداریے کے پس منظر کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو میں صحافت کی تاریخ تقریباً دو سو سال قدیم ہے۔ اور اردو صحافت میں اداریہ نویسی کی تاریخ اور روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے۔ لفظ اداریہ بنیادی طور پر صحافتی اصطلاح ہے۔۔ اداریہ کسی اخبار یا جریدے کی وہ تحریر ہوتی ہے، جو کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر حالاتِ حاضرہ کے سلسلے میں یا کسی ہنگامی اور فوری پیش آمدہ مسئلے پر اس لیے لکھے کہ قارئین ان مسائل پر توجہ دیں، یہ تحریر اداریہ کے نام سے موسوم ہے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات واحساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔ مروجہ مفہوم میں اداریے سے مراد وہ طبع زاد تحریر ہے، جو اخبار یا رسالے کے ادارتی صفحے پر اس اخبار یا رسالے کے نام کی لوح کے نیچے چھپتا ہے۔ اداریہ کسی بھی اخبار یا جریدے کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے بغیر اخبار یا جریدہ جسم بے روح کی مانند ہوتا ہے۔ اداریہ ملکی وبین الاقوامی خبروں سے وابستہ کسی بھی خبر یا واقعہ پر لکھا جاسکتا ہے۔ اداریہ کے ذریعے عوام کی رہنمائی کی جاتی رہے ہے۔ اداریوں میں متعلقہ موضوع سے جڑے ہوئے کئی مربوط واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ متعلقہ موضوعات کو باریک بینی

سے چھانا جاتا ہے۔ تاہم کئی بار جب کوئی سلگتا ہوا مدعا ہوتا ہے، تب اداریے صفحہ اول پر لکھے جاتے ہیں، اسے مقالہ خصوصی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ دور حاضر میں شاید اس کی

کو عوام کے سامنے لایا جاتا ہے تاکہ عوام انہیں اداریہ نویس کے نقطہ نظر سے بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ بعض اوقات ہنگامی صورت حال میں بھی اداریہ نویس قلم کی طاقت سے لوگوں میں امن پیدا کرنے کی

دیگر اُردو اخبار میں بھی اداریے کے بغیر شائع ہونے لگیں گے

ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اداریہ نویس کسی بھی واقعہ، صورتحال

کوشش کرتا ہے۔ اداریے عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ تشکیل

یا کسی اہم مسئلہ کے پس منظر، اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ زمینی حقائق کی روشنی میں اس کا حل بھی تجویز کرتا ہے، اداریہ نویس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے، اس طرح وہ درست سمت میں عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اداریے عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ تشکیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اداریوں میں قاری کو یقین دلایا جاتا ہے کہ فلاں طرز فکر صحیح ہے۔

اداریے کے بغیر اخبار یا جریدہ ایک جسم بغیر روح

مختلف اخبارات میں بہت سی خبریں تو ایک جیسی ہو سکتی ہیں لیکن اداریے نہیں۔ کیونکہ ہر اخبار کی پالیسی دوسرے اخبار سے مختلف ہوتی ہے اور اداریہ اخبار کی ترجمانی کرتا ہے، نیز اس اخبار کی پالیسی کا ضامن ہوتا ہے، اسی حوالے سے اداریہ اخبار کی پہچان بھی بن جاتا ہے۔ اسی حوالے سے اداریہ کا طرز بیان سنجیدہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اداریہ کے ذریعے حکومتی محکموں کا احتساب کیا جاتا ہے۔ ان محکموں میں کام کرنے والے کرپٹ افسران کی طرف حکومتی توجہ مبذول کروائی جاتی ہے، تاکہ حکومت ان کے خلاف کوئی اقدامات کر سکے۔ مختصر یہ کہ اداریہ کی مدد سے بہت سارے مسائل، واقعات

اداریہ نگار مسئلہ پیش کرتا ہے، اس کے حق میں یا خلاف دلائل دیتا ہے۔ ایک خاص انداز فکر کی تخلیق کرتا ہے اور آخر میں اپنے موقف پر زور دیتا ہے۔ ماضی میں بہت سی نامور شخصیات نے اپنے اخباروں کے اداریوں کی وجہ سے لوگوں میں انقلاب برپا کر دیا تھا

قوموں کو بیدار کرنے میں ماضی کے اخبارات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ماضی بعید میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، ابو الکلام آزاد، چراغ حسن حسرت جیسے نامور صحافیوں نے اپنے اخباروں کے اداریوں کی وجہ سے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ماضی قریب میں سید محمد تقی، فیض احمد فیض، احمد ندیم

خبریں سب اخباروں میں ایک جیسی مگر اداریہ مختلف

قاسمی، شورش کاشمیری، میر خلیل الرحمٰن، فخر ماتری، مجید نظامی، الطاف حسن قریشی، عبدالکریم عابد، مجیب الرحمٰن شامی، محمد صلاح الدین، نیر علوی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ موجودہ دور میں محمود شام، شاہنواز فاروقی، مقصود یوسفی وغیرہ کے اداریے بھی بہت جاندار ہوتے ہیں۔

اداریہ نگار

ادارتی کالموں میں وہ جس رائے کا اظہار کرتا ہے، اسے اخبار کی رائے اور پالیسی کے ساتھ اخبار کے قارئین کا ترجمان بھی کہا کہا جاتا رہا ہے۔ روزنامہ اعلان میں ہمارے سینئرز اکثر کہا کرتے تھے کہ جنگ، نوائے وقت، حریت اور جسارت، انگریزی اخبار ڈان کے اداریے پڑھا کرو۔ میں نے بلا شبہ ان اخبارات میں اداریہ لکھنے والے جید صحافیوں کے اداریے پڑھ کر ان سے استفادہ کیا اداریہ اگرچہ قارئین کی مختصر سی تعداد پڑھا کرتی ہے، لیکن یہ اپنی

افادیت کے حوالے سے بہت اہم ہوتا ہے۔ اب اداریے کا دور ختم ہو رہا ہے۔ آنے والی نسلوں کو شاید اخبار تو نظر آئے، لیکن اداریہ نہیں۔ ❁

حیدر آباد میں پروفیسر شاداب احمد صدیقی بیورو چیف "اطراف" کی حیثیت سے رات دن جدو جہد کرتے ہیں۔ ماہنامہ اطراف کو حیدر آباد کے کونے کونے میں متعارف کرواتے رہتے ہیں۔ "اخباری اداریہ نمبر" کے لیے ان سے گزرش کی گئی کہ وہ حیدر آباد سے شائع ہونے والے اُردو سندھی اخبارات سے قارئینِ اطراف کو متعارف کروائیں۔ انتہائی کم وقت میں انھوں نے ایک جامع تحریر سے نوازا ہے۔ پڑھیئے اور سندھ کے دوسرے بڑے شہر کی صحافتی دنیا کی سیر کیجئے۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔

حیدر آباد کے اُردو، سندھی اخبارات اپنا فرض منصبی بخوبی ادا کر رہے ہیں

تحریر: پروفیسر شاداب احمد صدیقی
بیورو چیف حیدر آباد

گزشتہ دنوں ایک پاکستانی موقر روزنامہ نے اچانک ایڈیٹوریل صفحہ سے اداریہ کو ختم کر دیا جس کی وجہ سے قارئین میں بے چینی اور تشویش پائی جاتی ہے۔ اداریے کی قدیم تاریخ ہے۔ اداریہ کا تاریخی پس منظر صحافت کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ اخبارات جب سب سے پہلے وجود میں آئے تو ان کا بنیادی مقصد خبریں پہنچانا تھا، لیکن جلد ہی یہ محسوس کیا گیا کہ محض خبریں دینے سے اخبار کا کردار مکمل نہیں ہوتا۔ قارئین کو نہ صرف معلومات درکار ہوتی ہیں بلکہ ان کی رہنمائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اداریہ متعارف ہوا۔

ابتدائی دور میں یورپ خصوصاً انگلینڈ اور امریکہ کے اخبارات میں اداریہ لکھنے کا رواج عام ہوا۔ انیسویں صدی میں بڑے بڑے اخبارات نے اپنے صفحات پر ایسے مضامین شائع کرنا شروع کیے جن میں کسی واقعے، پالیسی، یا مسئلے پر اخبار کا سرکاری نقطۂ نظر پیش کیا جاتا۔ یہی تحریریں وقت کے ساتھ "اداریہ" کہلانے لگیں۔ اداریہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں خبر کی طرح محض واقعات نہیں بیان کیے جاتے بلکہ واقعات کے پس منظر، ان کے اثرات اور ان کے ممکنہ نتائج پر روشنی ڈالی جاتی ہے، اور اخبار اپنی رائے بھی دیتا ہے۔ برصغیر میں جب انگریزوں نے اخبارات کی اشاعت کی اجازت دی تو یہاں بھی اداریہ کا آغاز ہوا۔ اردو صحافت کے بانی مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار دہلی اردو اخبار (1822ء) میں سب سے پہلے اداریاتی انداز اپنایا۔

بعد میں کلکتہ سے پہلا باقاعدہ اردو اخبار جامِ جہاں نما شائع ہوا، جس کے مدیر اور ناشر مولوی محمد عبدالباقر تھے۔ یہ اخبار اردو صحافت کا سنگِ میل ثابت ہوا۔

اس سے پہلے اخبارات میں صرف خبریں یا اعلانات شائع ہوتے تھے، لیکن مولوی عبدالباقر نے پہلی مرتبہ اپنے اخبار میں ایک مستقل کالم کی صورت میں اداریہ (Editorial) شامل کیا، جس میں حالاتِ حاضرہ پر اپنی رائے اور تجزیہ پیش کیا۔ یہی وہ بنیاد ہے جسے برصغیر میں اداریہ نگاری کی ابتدا مانا جاتا ہے۔ مولوی عبدالباقر کو اس جرات کی وجہ سے انگریز سرکار کی سخت ناراضی مول لینی پڑی۔ ان پر کئی مقدمات بھی قائم کیے گئے اور بالآخر 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے انہیں توپ کے دہانے پر باندھ کر شہید کر دیا۔ یوں وہ نہ صرف اردو صحافت کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد کے عظیم شہید بھی ہیں۔

بعدازاں سرسید احمد خان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ میں اداریے کو بہت شہرت ملی۔ ان اداریوں میں نہ صرف ملکی و سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا بلکہ عوام کی فکری تربیت بھی کی جاتی۔ یوں وقت کے ساتھ اداریہ اخبارات کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ آج بھی دنیا بھر کے اخبارات میں اداریہ ادارتی بورڈ کے اجتماعی موقف کو ظاہر کرتا ہے اور قارئین کو یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ اخبار مختلف مسائل پر کیا سوچ رکھتا ہے۔ اداریہ تاریخ میں ہمیشہ کسی اخبار کی سنجیدگی، علمی معیار اور فکری سمت کا عکاس رہا ہے۔

اخبارات انسانی معاشرے میں صرف خبریں پہنچانے کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ عوام کی رہنمائی اور رائے سازی کا بھی اہم کردار ادا کرتے آئے ہیں۔

مجھے بطور بیورو چیف حیدر آباد ماہنامہ اطراف یہ ذمہ داری تفویض کی گئی کہ حیدر آباد کے اخبارات اور چیف ایڈیٹر کے بارے میں تفصیلات قلمبند کروں جس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ حیدر آباد سندھ کا دوسرا بڑا شہر ہے یہاں بھی پرنٹ میڈیا کی بقا اور ترویج کے لیے اردو سندھی اخبارات اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں۔ حیدر آباد کے چیف ایڈیٹر اور صحافی نامساعد حالات میں بھی معیاری سستا اخبار شائع کر کے اپنے قارئین کو معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ حیدر آباد میں سنیئر صحافی موجود ہیں

جنہوں نے صحافت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ایسے ہی سنیئر صحافی علی حسن گزشتہ کئی برس سے بطور چیف ایڈیٹر روزنامہ سفیر

حیدرآباد کے اخبارات اداریوں میں عوامی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں

حیدرآباد کا اجرا کر رہے ہیں یہ بہت معیاری اور معلوماتی اخبار ہے

انتہائی کم قیمت میں فروخت ہو رہا ہے۔ اس میں اداریہ باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ روزنامہ پاسبان حیدرآباد 70 سال سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اس کے چیف ایڈیٹر ناصر علی راجپوت ہیں۔

روزنامہ سرمایہ حیدرآباد چیف ایڈیٹر احسان الحق راؤ،

روزنامہ انکوائری حیدرآباد، چیف ایڈیٹر ناصر علی راجپوت، روزنامہ نباہ حیدرآباد، چیف ایڈیٹر عبدالملک شیخ،

روزنامہ مہران حیدرآباد سندھی، چیف ایڈیٹر فقیر منٹھار منگریو،

روزنامہ کاوش حیدرآباد سندھی، چیف ایڈیٹر محمد ایوب قاضی،

روزنامہ عبرت حیدرآباد سندھی، چیف ایڈیٹر قاضی اسد عابد، روزنامہ کوشش حیدرآباد سندھی، چیف ایڈیٹر محمد ایوب قاضی، روزنامہ جیجل حیدرآباد سندھی، روزنامہ ہلچل حیدرآباد سندھی، روزنامہ سندھ ایکسپریس حیدرآباد سندھی،

حیدرآباد کے اداریے پر تبصرہ

حیدرآباد سندھ کے اخبارات کا اداریہ ہمیشہ شہر کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کی جھلک پیش کرتا ہے۔ ان اخبارات کے اداریے عام طور پر عوامی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں، جیسے کہ مہنگائی، بیروزگاری،

صحت و تعلیم کے فقدان، ٹریفک کے بگڑتے ہوئے حالات اور صفائی ستھرائی کے بحران۔ روزنامہ کاوش، روزنامہ عبرت، روزنامہ سفیر، روزنامہ مہران، روزنامہ سرمایہ، روزنامہ پاسبان اور دیگر مقامی اخبارات نے اپنے ادارتی صفحات پر ہمیشہ ان موضوعات کو نمایاں کیا ہے جو براہِ راست شہریوں کے روزمرہ سے جڑے ہوئے

ہیں۔ اداریہ دراصل اخبار کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں ادارتی پالیسی اور صحافتی بصیرت سامنے آتی ہے۔ حیدرآباد کے اخبارات کے اداریے قومی سیاست کے ساتھ ساتھ مقامی مسائل کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی کی قلت، بجلی کی لوڈشیڈنگ، نکاسیٔ

کاوش، عبرت، سفیر، مہران، سرمایہ، پاسبان، کوشش، حیدرآباد کے عوام کی آواز

آب کے مسائل اور شہری انتظامیہ کی ناقص کارکردگی اکثر ان اداریوں کا مرکزی نکتہ بنتی ہے۔ اسی طرح صوبائی و وفاقی حکومت کی پالیسیوں پر بھی تنقیدی تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ عوام میں شعور اجاگر ہو اور متعلقہ اداروں پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ قومی و عالمی سطح کے موضوعات پر بھی یہ اخبارات اپنی رائے دیتے ہیں، جیسے بھارت کی انتہا پسندی، کشمیر کی صورتحال، فلسطین پر مظالم، یا اقوام متحدہ کے فیصلے۔ لیکن چونکہ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والے اخبارات ہیں اس لیے ان کے اداریوں میں مقامی مسائل کو ترجیح زیادہ دی جاتی ہے تاکہ عوامی رابطہ مضبوط رہے۔ ان اداریوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عام آدمی کی زبان بولتے ہیں۔ ان میں اکثر جذبات اور شکوے بھی ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی عملی تجاویز بھی دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے عوام ان اخبارات کو محض خبروں کے لیے نہیں بلکہ اپنی آواز سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد سندھ کے اخبارات کے اداریے عوامی رائے کی تشکیل اور سماجی اصلاح کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حیدرآباد کے اخبارات کی خوبیاں

حیدرآباد کے مقامی اخبارات کی یہ خوبیاں ہیں کہ قیمت بہت کم 10 روپے، ABC سے تصدیق شدہ، اشتہارات کی زیادتی نہیں، پی ڈی ایف میں دستیاب ہیں، معیاری مستند خبریں اور پرنٹ کوالٹی بہت اچھی ہے۔ اداریہ لازمی ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے اخبارات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ پرنٹ میڈیا زندہ ہے۔ اگر ایمانداری محنت خلوص لگن جوش و ولولے کے ساتھ کام کیا جائے تو اس کا صلہ ضرور ملتا

حکومت اور بلدیاتی ادارے سنجیدگی سے اداریے پڑھیں اور مسائل حل کریں

ہے۔ حیدرآباد کے چیف ایڈیٹر اور صحافی اپنی استطاعت کے مطابق لالچ کے بغیر کام کر رہے ہیں۔ اگر کام سے عشق ہو تو ہر کام امر ہو جاتا ہے۔

اقدامات کے طور پر ضروری ہے کہ:

1. ادارتی صفحات کو مزید تحقیقی بنایا جائے تاکہ صرف تنقید کے بجائے ٹھوس حل سامنے آئیں۔

2. مقامی صحافیوں کو سہولتیں دی جائیں تاکہ وہ عوامی مسائل کو گہرائی سے رپورٹ کر سکیں۔

3. حکومت اور بلدیاتی ادارے ان اداریوں کو سنجیدگی سے پڑھیں اور عملی اقدامات کریں۔

4. اخبارات کو جدید ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر بھی اداریے شائع کرنے چاہئیں تاکہ نئی نسل زیادہ مستفید ہو۔

سعیدہ افضل پاکستان کی اس وقت سنیئر ترین اخبار نویس خاتون، ناول نگار۔ ہماری درخواست پر اپنی کہانی اپنی زبانی لکھ رہی ہیں۔ ایک پورا عہد اپنی تابانیوں اور شوکتوں کے ساتھ سامنے آرہا ہے کراچی یونیورسٹی جب اپنے عروج پر تھی۔ کیسے کیسے اساتذہ، شعبہ اردو میں پروفیسر ابوالخیر کشفی کلاس کی روداد، وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ اب یہ سعیدہ افضل کی سرگزشت نہیں۔ پاکستان کے سنہرے دنوں کی چمکتی دمکتی تاریخ قلمبند ہو رہی ہے۔ آج جب پاکستان ہر شعبے میں روبہ زوال ہے ان دنوں یہ مناظر کتنے حوصلہ افزا ہیں۔

جمعہ کا دن۔ ابوالخیر کشفی صاحب کا پیریڈ

قسط نمبر 24

سعیدہ افضل کی خودنوشت

آج مورخہ ۲۲ جولائی ہے۔

ابھی جناب محمود شام سے بات ہوئی ہے۔ خودنوشت ''عمر کا سورج'' بارے قسط لکھنی ہے۔ اور واٹس ایپ پر ان کی خوبصورت نظم سامنے آگئی ہے۔ بار بار پڑھتی ہوں۔

بھری کلاس ہے مگر
ہر ایک سمت خاموشی

بس اک صدا ہے گونجتی۔ جب میں پڑھتی ہوں عجب سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ جیسے کوئی مضراب کے تاروں کو چھیڑ دینے والا احساس یہ سہانا سا احساس کبھی مسرت بھرا، کبھی اداس کر دینے والا اس نظم میں بہت سے رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ خوشی کے اور مغموم کر دینے والے بھی۔۔۔۔۔۔۔ ہر شعر سے ایک منظر عبارت ہے ماضی میں لوٹ جانے کی آرزو بعید سے آتی مانوس صدائیں۔ وہ منظر جو دلکش تھے اور دور چلے گئے، مٹ گئے مگر نہیں مٹے۔ آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ اور اس کلاس روم میں جا کر بیٹھ جاتی ہوں جو موجود ہے اور نہیں بھی ہے۔

آج جمعہ کا دن ہے ابوالخیر کشفی صاحب کا پیریڈ ہے۔ جیسے ابھی یونیورسٹی بس سے اُتری ہوں تیز تیز قدموں بھاگتی ہوئی۔ آرٹس بلاک کی طرف۔

آج تو بہت لیٹ ہوگئی کشفی صاحب کلاس لے رہے ہیں۔ لگتا ہے کلاس روم میں کوئی موجود نہیں ہے۔

اور اک ہر نگاہ لیکچرر کی سمت دوڑتی ہوئی۔

ہر ایک گوش مستعد

ہم جماعت کلاس روم میں موجود ہیں۔ مگر وہ بالکل خاموش ہیں۔ ہمہ تن گوش اور کشفی صاحب الفاظ کا جادو جگا رہے ہیں۔ وہ جب لیکچر دیتے ہیں سننے والوں کو اپنی رواں بیانی سے مسحور کر لیتے ہیں۔ ان کے جملے بامعنی، خوبصورت خوابیدہ ذہنوں کو جگا دینے والے حروف، جیسے پھول قطاروں میں فہم کی سوئی سے سوچ کے دھاگوں میں پروئے ہوئے۔ وہ اپنے وسیع مطالعے کی بدولت طالب علموں کے ذہنوں کو نکھارتے سنوارتے ہوئے۔ نسل نو کو کامیاب زندگی کے اسرار و رموز سے آگہی دیتے ہیں۔ لگتا ہے۔ غالبؔ و اقبال کی شاعری کو پڑھاتے ہوئے ہم کو مستقبل میں شاندار منزلوں کو سر کرنے کا حوصلہ بھی دے رہے ہیں۔

سرِ آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

میں اس سحر کو توڑنا نہیں چاہتی تبھی ان کے برابر والے دروازے سے داخل ہونے کی بجائے پچھلے دروازے سے دبے قدموں کلاس روم میں داخل ہوتی ہوں نہیں چاہتی ان کو میری آمد کا علم ہو۔۔۔۔ لیکچر میں محو ہونے کے باوجود ان کو علم ہوگیا ہے۔ وہ ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہیں متوازن آواز میں مخاطب ہوتے ہیں۔

سعیدہ۔۔۔۔۔ آگے آجاؤ۔۔۔۔۔ اپنی سیٹ پر بیٹھو۔ وہ جانتے ہیں۔ میں ہمیشہ اگلی رو میں اپنی مخصوص نشست پر ہی بیٹھا کرتی ہوں، میں آخری قطار سے اُٹھ کر، شرمندہ سی پہلی قطار میں آکر بیٹھ جاتی ہوں۔

سعیدہ افضل، تم آج کل لیکچرز مس کرنے لگی ہو، جانتی ہو، وقت کی پابندی سے زندگی کی کامیابیاں جُڑی ہیں۔

''جی سر۔۔۔۔۔، میں بس، اسی قدر کہہ پاتی ہوں اور سر کو جھکا لیتی ہوں، یونیورسٹی بس کو دل ہی دل میں کوستی ہوں کہ اس کے آرام باغ سٹاپ پر نہ رُکنے کی وجہ سے مجھے دوسری بس لے کر تین ہٹی کے سٹاپ پر جانا پڑا تب ہی یونیورسٹی بس پکڑ پائی تمام پیریڈ نکل گیا وہ مجھے گم صم دیکھ کر کہتے ہیں۔

آپ لوگوں کی مجبوریاں اپنی جگہ لیکن۔۔۔۔ یاد رکھیے۔ اک بلائے

سعیدہ افضل نوشابہ صدیقی کے ہمراہ ہم دم دیرینہ کراچی یونیورسٹی برسوں بعد جامعہ کراچی کی تقریب میں ایک بار پھر ایک ساتھ

ان کے جملے با معنی۔سوئے ذہنوں کو جگانے والے

نا گہانی اور ہے،اور وہ ہے ''امتحان''۔۔۔''

جانے وہ کس امتحان کی بات کرنے جا رہے ہیں۔ان کا پیریڈ ختم ہوگیا ہے وہ باہر چلے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی میرا پلک جھپکتے کا خواب بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

میں بند آنکھیں کھول دیتی ہوں اور کھلی آنکھوں کی دنیا میں لوٹ آتی ہوں۔

میرے سامنے محمود شام صاحب کی نظم اب تک رکھی ہوئی ہے۔میں اسے پھر سے پڑھنے لگتی ہوں۔

کلاس روم

کبھی تو ورڈز ورتھ کے حسین، شعر کا بیان
کبھی فراق کی غزل
کبھی صفر کی ویلیو،کبھی ہے فکر برگساں
بھری کلاس ہے مگر، ہر ایک سمت خاموشی
بس اِک صدا ہے گونجتی،
سمٹتے جسم کرسیوں میں ڈوبتے ہوئے بدن
کمر ذرا جھکی ہوئی
ہر ایک میز پر گداز بازوؤں کے دائرے
بھرتے سر،تنی بھویں۔
ہر اِک نگاہ لیکچرر کی سمت
دوڑتی ہوئی۔
ہر ایک گوش مستعد
یہ پات پات،صورتیں، یہ باغ باغ انجمن
نہ مل سکیں گی۔۔۔۔پھر یہاں۔
بکھیر دے گی وقت کی گھناؤنی ہوا انھیں
نجانے کل کہاں کہاں۔۔
ابھر پڑیں گی زندگی کی دلگداز راہ میں
جدائیوں کی خندقیں

(محمود شام)

یہ جمعہ کا دن تھا۔

جمعہ کا دن یوں تو مبارک ہوتا ہے مگر کراچی یونیورسٹی کے طلبا کے لئے جمعہ،خاص ٹہل'' کا دن ہوتا۔یوں کہ لائبریری بند ہوجانے کی وجہ سے طلبا و طالبات جلد گھر کی راہ لیتے اور بس سٹاپ پر ٹھہر کر انتظار کرنے کی بجائے آگے چل پڑتے تا کہ سامنے سے آنے والی بسوں کو ہاتھ دے کر سٹاپ تک جانے سے پہلے روک لیں اور سوار ہوجائیں۔تبھی بسوں کی کم یابی نایابی میں بدل جاتی۔

وہ بھی جمعہ کا دن تھا۔اس روز گرمی زیادہ تھی دوپہر کا وقت اور سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا،آج بلقیس نہیں آئی تھی میں اکیلی سٹاپ پر کھڑی تھی۔اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، میرے علاوہ باقی تمام طلبا تھے لڑکی کوئی وہاں نہیں تھی۔ البتہ کچھ طالب علم ٹولیوں کی صورت آگے جا رہے تھے، جب کوئی شناسا لڑکی نہ ملی مجھے کلفت ہوئی۔

کندھے پر بیگ لٹائے اُسی کاروان تیز گام لڑکوں کے پیچھے چل دی جب کچھ آگے جا کر بس پکڑنی تھی۔

اس سنہری دھوپ کے سائے سائے یہ راہی تیز گام تو خوش گپیوں

محمود شام صاحب کی نظم ''کلاس روم میرے سامنے

میں سفر کی کلفت کو کو اُڑا رہے تھے مگر ہم لڑکیاں موسم کی تمازت سے پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھیں اوپر سے کالے رنگ کا بھاری ''گون'' بھی پہن رکھا تھا۔

اس کارواں میں کچھ تو واقعی تیز گام تھے مگر کچھ یوں اطمینان وسکون سے ٹہلتے جا رہے تھے۔جیسے یہ ٹہل زندگی کے مصائب سے مقابلہ کرنے کی طرف اُن کا پہلا قدم ہو۔

اُن کی سست روئی پر غصہ آنے لگا کیونکہ اس وقت دھوپ سنہری نہیں آتشی ہو رہی تھی۔ایسے میں ٹہل قدمی کی کیا تک بنتی تھی۔دعا کی یا اللہ کوئی تو ہم دم دیرینہ ملے تبھی کسی نے مدھم لہجے میں میرا نام لیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا نوشابہ صدیقی کے ساتھ طاہرہ جلیل اور انیس تفضّل چلی آ رہی تھی۔

''سعیدہ اِدھر آ جاؤ ہمارے ساتھ''۔۔۔۔بارے دل کو سکون ملا۔ آخر کسی، اچھے ہم سفر کی خواہش نے ہم کو ہم دم دیرینہ سے ملوا ہی دیا۔۔۔۔میں منچلوں کے پیچھے قدم ناپ ناپ کر چلنے کی بجائے ان کے ساتھ شامل ہوگئی چونکہ اُس گرم دن یہ تنہا خرامی واقعی مجھے کھلنے لگی تھی۔گو ہوا چل رہی تھی مگر گرم لُو کی صورت۔صبح بس نکل گئی تو پیریڈ تمام ہونے کے بعد کلاس میں پہنچی اب دوسری غلطی کر لی تھی جلدی بس پکڑنے کے خیال سے اور اب سٹاپ۔۔۔۔تالاب، کنول سبزہ سبھی کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ہم کافی آگے نکل آئے تھے اور کوئی بس ابھی آتی دکھائی نہ دے رہی تھی تو اسے میں یہی کوشش تھی کہ کوئی ہم سفر، ہم خیال، ہمراہ ہو جائے تا کہ چمنستانِ خیال میں بہار کا تصور جھانے نہ پائے لہٰذا اس کلفت سفر کو کم کرنے کے لئے جناب فیض کے زنداں نامے، کا سہارا لیا جس کا ہر شعر ہمیں از بر تھا۔چونکہ بیت بازی کی شہسوار نوشابہ صدیقی ہمارے ساتھ تھیں لہٰذا گنگنانا شروع کر دیا۔

صبا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے۔ بہار کا موسم

تم کو اس آگ برساتی دوپہر میں بہار کا موسم نظر آ رہا ہے انیس تفضّل (جو بعد میں انیس ہارون ہوگئی) نے کہا۔

نہیں بھئی ،بہار نہیں، بلکہ انتظار
روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

اچھے بھلے ہم سٹاپ پر کھڑے تھے کسی وقت تو بس آ جاتی نوشابہ نے طاہرہ جلیل سے شکوہ کیا، تمہیں منع کیا تھا نا؟ شرارتی لڑکی ہم فیض صاحب کے زندان نامہ، میں ایسے کھوئے کہ بس ہمارے برابر سے نکل گئی، ہم میں سے کسی نے اُسے رُک جانے کا اشارہ نہیں کیا۔

تو اب یہ سٹاپ پر جا کر ہی رُکے گی، طاہرہ جلیل نے ٹھنڈی آہ بھری۔اور حسرت سے پیچھے مڑ کر نکل گئی بس کی طرف دیکھا۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشنِ صوت ِ ہزار کا موسم

سعیدہ جب تک دوسری بس آتی نظر آئے کچھ اور سہی۔زنداں نامہ، سے

ابھی کچھ یاد نہیں آ رہا گاؤن کے اندر پسینہ بہتا آ رہا ہے۔

یادداشت کا سہارا لو۔محترمہ ادیبہ (ادیبہ اس لئے کہ ان دنوں میری نظمیں غزلیں ''سہ ماہی سیپ'' میں چھپی تھیں۔)

دیکھو بھئی نوشابہ، اشعار کے معاملے میں تمہاری یادداشت غضب کی ہے،تم بیت بازی میں اپنے گروپ کی لیڈر رہوتی ہو۔ابھی کچھ دنوں پہلے نئے اور پرانے طالب علموں کے مقابلے بیت بازی میں تم نے میرے قدم جمنے نہیں دیئے تھے۔

میری یادداشت پر تکیہ کیا تو اچھے اچھے اشعار کے مفہوم بدل بدل جائیں گے۔اور پھر کیا پتہ خفا ہو کر فیض صاحب شعر کہنا چھوڑ دیں اور دیکھو اس وقت تو سورج نصف النہار پر ہے

سعیدہ ایسی بھی بات نہیں مجھے یقین ہے تم شعر صحیح پڑھو گی ایم اے اردو کی طالبہ ہو آخر۔۔۔تبھی میں نے ذہن میں زنداں نامہ، پھر سے کھول کر ورق گردانی شروع کر دی۔۔۔۔دونوں میری طرف متوجہ تھیں، طاہرہ اور نوشابہ جبکہ انیس اپنے کسی خیال میں گم چل رہی تھی۔

ارے بس نکل گئی۔

ہم نے آدھا رستہ طے کر لیا دوسری بس بھی نہ پکڑ سکے اُف یہ نازک مزاج بسیں۔۔۔اب یہاں نہیں رکنے والیں ہم سے آگے چلنے والا دکھائی دیں۔

لو یک نہ شد تین شد۔۔۔ چلو بڑھو طاہرہ آگے۔۔۔نوشابہ نے

گھر جا کر یونیورسٹی کی ان چندا بسوں کے بارے میں مضمون ضرور لکھنا

ڈپٹ کر کہا۔ وعدہ وفا کرنے کا وقت آ گیا ہے مگر عین وقت پر طاہرہ نے ہمیں دھوکا دیا۔ جونہی بس قریب آئی وہ ایک طرف یوں کھسک لی کہ ساری بسیں یکے بعد دیگرے چل دے گئیں اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔

لو اور کر لو اپنے جامعہ کے بھائیوں کی نقل، ہم بھلا چل سکتے ہیں ان کے نقشِ قدم پر چلو واپس۔ بس سٹاپ پر۔۔۔ بس وہاں سے ہی ملے گی۔ نوشابہ نے حکم دیا۔ ہم سب نے آنسو پی کر اپنی اپنی ڈفلی بجائی پھر بہادرانہ شان سے مُڑ کر سٹاپ کی جانب چل دیئے۔

''دیکھو ان لڑکوں کو۔۔۔ یہ سیاہ گون پہنے ہیں کیا یہ معزز گون ان پر جچے گا۔؟''

ان کو بھری دھوپ میں مذاق کی سوجھ رہی ہے اور ہم پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں۔ انیس نے افسوس کا اظہار کیا تو میں نے کہا۔۔۔ بھئی مجھے تو گدھا گاڑی والے سے شرم آ رہی ہے۔

کیا سوچتا ہو گا پڑھے لکھے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

ایسے ویسے کیا ہوتے ہیں جناب میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آگے نہیں جاتے یہ بس کو بیچ رستے سے اُچکنے کی کوشش بے اصولی ہے۔ یہیں سٹاپ سے ہی سوار ہوں گے۔ اب جو طلبہ چلچلاتی دھوپ میں صحیح جگہ صبر سے کھڑے انتظار کر رہے ہیں سوار ہونے کا پہلا حق تو ان ہی کا ہے یا کہ۔۔۔۔۔ شارٹ کٹ کا رستہ اختیار کرنے والوں کا۔۔۔ اب بتاؤ طاہرہ جلیل صاحبہ۔۔؟

بس بھئی بس۔۔۔ نوشابہ صاحبہ۔۔۔اب اور نہ ڈپٹو۔۔ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ تم مستقبل میں صحافی بنو گی یا پھر کسی

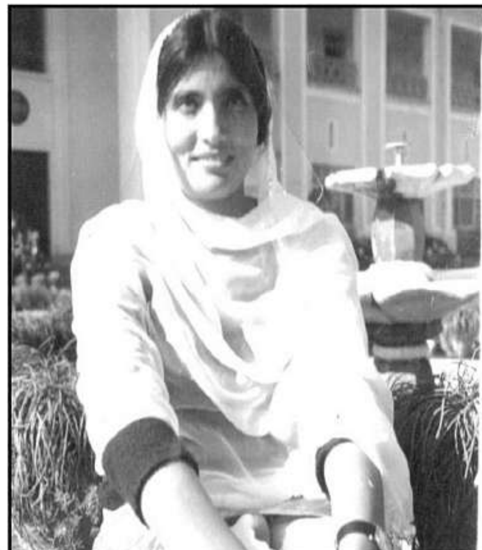

کراچی یونیورسٹی پلیا کنارے 1966ء

آتشی دھوپ۔ نوشابہ صدیقی، طاہرہ جلیل، انیس تفضّل

یہ ہوتا ہے اصولوں پر نہ چلنے والوں کا انجام، مستقبل کی مصنفہ مضمون نگار اور آنے والے خوش آئند وقت کی پرنسپل نوشابہ صدیقی نے کالج کی پرنسپل (اور میری دونوں پیش گوئیاں پوری ہوئیں) نوشابہ صدیقی گیارہ کتابوں کی مصنفہ، صحافی بھی ہوئیں (اخبارِ جہاں کے

کلاس روم پر پروفیسر جمیل اختر، پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے اساتذہ کے ساتھ 1966ء

لڑکوں کا ٹولہ کب کا بس کو درمیان میں روک کر اس میں سوار ہو کے جا بھی چکا۔۔۔ ہم اشعار پڑھتے رہ گئے۔

وہ تو ہاتھوں کی زنجیر بنا کر قطار میں بیچ سڑک کے کھڑے ہو جاتے ہیں یوں بس روک لیتے ہیں۔۔۔۔ طاہرہ زچ ہو کر بولی۔

بسیں چھٹتی رہیں، ہم فیض کے اشعار پڑھتے رہے

ہاں۔۔۔ تم لوگوں کی طرح ''زندان نامہ'' پڑھتے ہوئے تو نہیں چلتے۔ انیس نے بات بڑھائی۔

تو کیا ہم بھی زنجیر بنا کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو جائیں؟

اس طرح تو تین چار جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

تین چار کیوں۔۔۔ کوئی ایک قربانی دے دے۔۔۔ ہے کسی میں دم؟ نوشابہ مذاق کے موڈ میں آ گئی۔

مجھ میں دم ہے طاہرہ سدا کی شرارتی خم ٹھونک میدان میں اُترنے کا وعدہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے اُسی دم وعدہ وفا کرنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ اب اُسے سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر بس کو رُکنے کا اشارہ کرنا تھا۔

یکا یک ۔۔۔ ایک نہ دو۔۔۔ پوری تین بسیں آگے، پیچھے آتی ہمیں یاد دلایا۔ اتنے میں ایک چھن چھناتی گدھا گاڑی کھاد کی بوریاں جس پر لدی ہوئی تھیں ہمارے پاس سے گزری۔

''بھئی گدھا گاڑی والے۔ ان کو بٹھا لو۔۔۔ سامنے سے آتے طلبا میں سے ایک نے کہا۔۔۔۔ تبھی گاڑی والے نے ایک اچٹتی نظر ہم پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

پہلے پیج میں شامل تھیں) اور پرنسپل بھی۔

اچھا اب اُداس مت ہو۔۔۔ گھر جا کر یونیورسٹی کی ان چندا۔۔۔ (چند) بسوں کے بارے میں مضمون ضرور لکھنا۔

(جاری ہے۔)

"جناب محمد اشفاق بدایونی اُردو کے عشاق میں سے ہیں۔ صاحبِ مطالعہ، جدہ میں رہتے ہیں۔فکر پاکستان کی رکھتے ہیں۔جدید وقدیم وسائل سے بھی آگاہ ماضی حال مستقبل کے مسائل سے بھی باخبر۔سیلاب زدگان میں سے ایک چاچا کے ناپسندیدہ یا نامناسب الفاظ وائرل ہو گئے ہیں۔جدہ میں مقیم اشفاق بدایونی پھر الفاظ سے کیسے کھیلتے ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔"

فرد کی آواز۔ معاشرے کی آواز

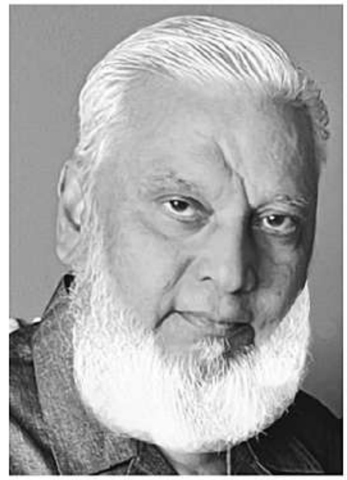

تحریر: محمد اشفاق بدایونی (جدہ)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اکیسویں صدی اپنی چوتھائی کی حد عبور کرنے والی ہے مگر عصرِ جدید میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے تو گمان کے پرخچے اُڑا کے رکھ دیئے ہیں۔صوتی الات کی، بصری آلات کی،غنائی آلات کی اور نشریاتی اور برقیاتی آلات کی ٹیکنالوجی نے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ اگر کوئی چاچا بارش کے بعد زیرِ آب آئے ہوئے شہر کے کسی علاقے میں اپنی پرانی موٹر سائیکل کے ساتھ سفری دقتوں کا سامنا کرتے ہوئے حکومتی اداروں کی اور وقت کے خفی وظاہر طاقتور حکام کی نااہلی

حکام وقت ندمت کے بجائے مرمت کے قائل ہو گئے ہیں

پر اپنے غصّہ کا اظہار کرتا ہے اور کم مائیگیِ علم کے سبب کچھ نامناسب الفاظ کا استعمال کرتا ہے اور یقیناً ایسے نامناسب الفاظ کی ہر کوئی مذمت کریگا مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی شخص کے منہ سے نکلے ہو الفاظ فرد کے جذبات کے عکاس ہوتے ہیں اور فرد چونکہ معاشرے کی اکائی ہوتا ہے لہٰذا سکے الفاظ کو جمع کی شکل میں معاشرے کی آواز سمجھنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ کہ اگر کسی فرد کی کسی بات پر آپ تلملا اُٹھیں تو آپ کا تلملانہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ کہیں تو کچھ دال میں کالا ضرور ہے مگر دال میں کالے کا پتہ لگانا اس لیئے مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں پکتی ہی کالے چھلکوں والی دال ہے تو اُس میں کالا تلاش کرنا کارِ زیاں کے سوا کچھ نہیں۔

اگر اک حلقۂ شعور وادراک کی جانب سے ایسے نامناسب الفاظ کی مذمت کردی بھی جاتی تب بھی اعلیٰ ایوانوں میں بیٹھے مقتدر حکامِ وقت مذمّت کے بدلے مرمّت کروادیتے ہیں اور مرمّت کے بعد مرمّت شدہ فرد باہر آکر اُس کالی دال کو سفید ماش کی دال کہنے لگتا ہے تو عوام کی اکثریت ایسی مرمّت کو اعلیٰ ایوانوں کی کھرکھلی اور بے بنیاد دیواروں کے وجود پر ایک طنزیہ قہقہے ہی لگا سکتی ہے۔

اس طرزِ مرمّت سے ایک بات تو یقینی ہوجاتی ہے کہ چاچا کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ دوسرے یہ کہ اعلیٰ ایوانوں میں بٹھائے گئے نرم و نازک سیم تناں اپنی عشوہ پردازیوں کے باوجود خود کو غیر محفوظ اور عوام کے دلوں سے دور پاتے ہیں۔

ہماری اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں ہمارے ایک محترم استاد جو ہمیں اردو پڑھاتے تھے انتہائی شفیق مدبر اور لائق اساتذہ میں انکا شمار ہوتا تھا جو بسا اوقات نصابی کتب سے ہٹ کر کتابِ زندگی کے بھی کچھ اوراق پڑھا دیا کرتے تھے ایک دن مجھے برادر خورد کہہ کر مخاطب کیا اور فرمایا کہ خدانخواستہ کبھی کوئی فرد سڑک پر چلتے ہوئے پیچھے تمہیں تمہارا نام اشفاق کہہ کر مغلظات بک رہا ہو تو تم وہاں اسطرح گزر جانا کہ جیسے اشفاق تمہارا نام ہی نہیں ہے تو اردگرد سے گزرنے والے اس شخص کو جاہل اور بے وقوف سمجھیں گے کہ دیکھو اپنے آپ سے بولے جارہا ہے لیکن اگر آپ طیش میں اکر اسکی گالیوں پر پلٹ بھی گئے تو اردگرد کے لوگ جو آپ کو نہیں بھی جانتے ہونگے انکو بھی پتہ چل جائیگا کہ یہ گالیاں آپ کو ہی پڑ رہی تھیں۔

کیا میری اس بات سے اتفاق کرینگے کہ چاچا کی اس حرکت کو نظر انداز کرکے اس عامیانہ جملوں والی ویڈیو کو بے اثر کیا جاسکتا تھا مگر سوفٹ ویئر کو اپ ڈیٹ کرواکر بناوٹی بیان دلوا کر اپنے خوف اور کھوکھلے پن کا ثبوت دینا کچھ اچھا نہیں لگا۔

ہاں انتقام کی آگ میں جل کر اسکو سزا دیتے ظلم کرتے سوفٹ ویئر اپ ڈیٹ کرتے مگر معذرتی بیان کی ویڈیو نے ڈھول کی پول کھول کے رکھدی۔

ہمارے سیاستدانوں کو اس بات پر بڑا گھمنڈ تھا کہ اگر عوام کے سامنے کوئی بے بنیاد بیان دے بھی دیا تو آئندہ انتخابات تک عوام یہ بھول جائیں گے کہ میں کیا کہا تھا مگر یہ ظالم آرٹیفیشل انٹیلیجنس (مصنوعی ذہانت) کا دور ہے یہ کمپیوٹر نہ صرف یہ کہ خود بھولتا نہیں بلکہ موقع اور ضرورت کے وقت آپ کو یاد دلا دیتا ہے کہ فلاں موقع پر موصوف نے یہ بیان دیا تھا تو عوام خود ہی سیاستدانوں کی اصلیت جان چکے ہیں۔

آپ کے مرمت کے بعد والے بیان کی ویڈیو کو مشتہر کرنے سے آپکی جھوٹی انا کو تو مطمئن کر سکتی ہے مگر عوام اب ہر بات کی اصل جاننے میں بڑے ماہر ہوچکے ہیں اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ چاچا کے وہ الفاظ کہیں رُکنے کا نام نہیں لے رہے ہر روز فرد کی تبدیلی کے ساتھ عوام اُس بات کو دبنے نہیں دے رہے ہیں۔

یہ ایک آفاقی سچ ہے کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلی بات کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ اگر کسی بات پر اتنا واویلا نہ مچایا جاتا تو بات از خود دم توڑ دیتی ہے مگر رعایا سے بادشاہ کے بلا واسطہ دست و گریباں ہوجانے سے اسی نشانے پر ان گنت تیر آنے لگتے ہیں تو

چاچا کے الفاظ کہیں رکنے نہیں پا رہے ہیں

پھر شکیب جلالی کے اس شعر کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

کتنے ہی زخم ہیں مرے اک زخم میں چھپے
کتنے ہی تیر آنے لگے اک نشان پر"

منہ سے بات بعد میں نکلتی ہے مگر پہلے دل میں آتی ہے اسی لیئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

مہناز حسن زیدی کی یادیں اب سندھ کے انتہائی بدحال ادوار میں داخل ہوگئی ہیں۔ ایک بہن وزیر اعظم اور ان کے حکومت میں ان کے سگے بھائی کا قتل۔ وزیر اعظم کی روتی ہوئی آنکھیں۔ والدہ سکتے میں۔ مہناز حسن نے سب کچھ دیکھا۔ یہ مشاہدات قارئین کے لئے تاریخ کے اوراق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ممنون ہیں۔ مہناز حسن صاحبہ کے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کی انتہائی اہم اندررنی کہانیاں لکھنے کی جرأت کر رہی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

شفیق الرحمٰن پراچہ نے محکمۂ اطلاعات کو خوابِ غفلت سے جگایا

قسط نمبر 9

تحریر: مہناز حسن زیدی

تعلقاتِ عامہ اور وہ بھی ایک خاتون، ایک محنت طلب اور مشکل کام ضرور تھا۔ آج کے مقابلے میں 90 کی دہائی میں اتنی سہولتیں بھی دستیاب نہ تھیں۔ ذرائع ابلاغ کے ہر ادارے میں ذاتی طور پر خود جانا پڑتا تھا اخباری نمائندوں، مالکان اور دیگر اخباری تنظیموں سے آپ کے بہترین روابط اور تعلقات آپ کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی جس میں معمولی سی غفلت بھی آپ کو ناکامی و نامرادی کی بھیانک تصویر دکھاتے دیر نہیں کرتی تھی۔ سندھ کابینہ ہو، گورنر ہاؤس وزیر اعلیٰ ہاؤس یا ممبران سندھ اسمبلی سب کی توقع ایک PRO سے یہی ہوتی تھی کہ اگلے دن کے اخبار میں ان کی کارکردگی جلی سرخیوں میں ضرور شائع ہوگی۔ اور اگر روزانہ کسی وزیر یا مشیر کی خبریں ہر اخبار میں دھڑا دھڑ شائع ہوتی رہیں اور صرف ایک دن اس میں کمی آ گئی تو سمجھئے اس دن تو PRO کی شامت آتی کہ اور اگر کوئی وزیر یا مشیر خاتون ہے تو بس مت پوچھئے PRO کا جو حال ہوتا اس کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ ”قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے“ افسر تعلقات عامہ کے لے عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی کام تو ہر حال کرنا ہوتا ہے۔ اپنی کارکردگی کے لئے جوابدہ تو ہونا پڑتا ہے۔

آج کا کام اچھا ہو یا برا، آج گزر جاتا ہے آپ کو بحیثیت PRO کل کی فکر ہونے لگتی ہے۔ بیگم عزیزہ جیلانی کے معیار پر پورا اتر نا بڑا ہی مشکل تھا۔

میری اپنی ناؤ اتار چڑھاؤ کا شکار تھی میں سفاک لہروں کی زد پر تھی آج کی کامیابی آنے والے کل کی کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتی تھی۔ مشیر بہبود آبادی کا مجھ سے اکثر یہی سوال ہوتا تھا ”آخر میری خبر فرنٹ پیج پر کیوں شائع نہیں ہوتی۔“

بیگم عزیزہ جیلانی نہ صرف سندھ کے بزرگ پیر محفوظ کی صاحبزادی تھیں بلکہ سندھ کے چیف سیکریٹری سلیم عباس جیلانی کی اہلیہ بھی تھیں۔

محترمہ بینظیر بھٹو سے ان کی بڑی قریبی دوستی تھی۔

سندھ میں مشہور درگاہ لواری شریف کے اصل مرید گل حسن کی بیٹی پیر محفوظ سے بیاہی گئی تھیں۔ پیر محفوظ زمیندار تھے اور سندھ میں ان کی کافی زمینیں تھیں۔ گل حسن کی وفات کے بعد مریدوں کے دو گروپ بن گئے تھے ان کے مریدوں میں دادا بھائی سیمنٹ والے بھی شامل تھے۔

پیر محفوظ کے جیلانی خاندان سے قریبی تعلقات رہے تھے جس کی وجہ سے پیر محفوظ نے اپنی بیٹی عزیزہ کی شادی سلیم عباس جیلانی جو بعد میں سندھ کے چیف سیکرٹری بھی رہے اُن سے کر دی۔ وہ اس سے پہلے زیادہ تر سندھ میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تو ان رہائش زیادہ تر سندھ ہی میں رہی۔

بیگم عزیزہ جیلانی سندھ کے وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ کی مشیر بہبود آبادی مقرر ہوئی تھیں۔ وہ ایک نہایت فعال اور کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات بحیثیت PRO ہوئی تو میں ان کی مسحور کن شخصیت میں ہی گم ہو کر رہ گئی۔ وہ مجھ سے بڑی تفصیلی گفتگو کر رہی تھیں اور میں ہوں ہاں میں ہی جواب دے پا رہی

شفیق الرحمٰن پراچہ

تھیں۔ اُن کی گفتگو نہ صرف ان کے آئندہ دائرہ کار کے گرد گھوم رہی تھی وہ اپنے مقاصد کا احاطہ کئے ہوئے تھیں بلکہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انھیں صرف میرے دفتری امور سے واقفیت ہی میں دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ میری نجی زندگی کو بھی بہتر طور پر جاننے کی خواہش مند تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید وہ یہ جاننا چاہ رہی تھیں کہ میں گھریلو کاموں میں کس حد تک

مصروف ہوں کیا میں اس قابل بھی ہوں کہ ان کے معیار کے مطابق اپنی کاوشوں میں آگے جاسکتی ہوں دفتری اور گھریلو امور کی واقفیت کے بعد انھیں اس امر کا اطمینان ہوچکا تھا کہ آئندہ مشیر بہبود آبادی کی کارکردگی عوام الناس تک کامیابی سے پہنچ سکے گی۔ مجھے بھی اطمینان

آخر میری خبر فرنٹ پیج پر کیوں شائع ہوئی

ہوگیا کہ وہ ذمہ دار عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بیٹی کی ماں بھی ہیں۔ جو دوسروں کی بیٹیوں کے لئے بھی اسی طرح سوچتی ہیں جس طرح وہ اپنی بیٹی کے لیے سوچتی ہیں۔ میری مختصر سی فیملی کے بارے میں جان کر انھیں یہ اطمینان ہوچلا تھا کہ میرا انتخاب ان کے لئے مناسب ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب میرے سسر، ساس اور ہم میاں بیوی ساتھ ہی رہتے تھے۔ انھیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ میں اس گھر کی اکلوتی بہو ہوں وہ میرے ساتھ بڑی حد تک تعاون کرتی تھیں۔ ان کی اپنے شعبے سے متعلق سرگرمیاں اخبارات میں اچھی جگہ پا رہی تھیں ان کی کوریج سے وہ مکمل نہیں تو جزوی طور پر مطمئن ضرور تھیں۔

میری ذمہ داریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ میں صبح 9 بجے سے لے کر شام گئے تک دفتری امور نمٹاتی رہتی۔ اس دوران میرا رابطہ شوہر اور گھر والوں سے مسلسل رہتا تھا۔ میرے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسائل کو جتنا میرے شوہر سمجھ رہے تھے شاید ہی کوئی دوسرا سمجھ سکتا تھا۔ اللہ مغفرت فرمائے میرے ساس سسر نے کبھی بھی میری دفتری ذمہ داریوں کی وجہ سے مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہ کیا شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بھی گھر اور دفتر میں توازن رکھا ہوا تھا۔ ان کے ناشتے اور دوپہر کھانے کے اوقات مقرر تھے مجھے یاد نہیں کہ ان کی حیات میں میری وجہ سے ان کے یہ اوقات متاثر ہوئے ہوں۔

مجھے اکثر دفتری امور کے سلسلے میں شہر سے باہر بھی جانا پڑتا تو میں ایڈوانس میں گھر کے افراد کے لئے مختلف کھانے پکا کر فریز کر دیا کرتی تھی کہ جب جس کا جو دل چاہے انھیں مل جائے اور انھیں کھانے کے سلسلے میں کوئی تکلیف نہ ہو اس وقت میری ساس مرحومہ حیات تھیں وہ سالن گرم کرلیا کرتی تھیں اُن کا یہ تعاون میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے بیگم عزیزہ جیلانی سے طویل گپ شپ کا بھی موقع ملتا تھا۔ ہمارا قیام اکثر سندھ کے ریسٹ ہاؤسز میں ہوتا تھا۔

ہماری گفتگو کا سلسلہ اکثر رات کے کھانے کے بعد شروع ہوتا اور ادھر رات کے بارہ بجنے والے ہوتے کہ وہ کھڑی ہوجاتیں اور مجھ سے کہتیں ''میری نماز کا وقت ہورہا ہے'' کراچی میں یہ مواقع بہت کم ملتے تھے۔ وہاں تو ہمارا زیادہ تر وقت مختلف میٹنگز اور پروگراموں میں گزر جاتا تھا۔

وزیراعلیٰ سندھ سیّد عبداللہ شاہ کے دور میں دو تین ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں بیگم جیلانی کے ہمراہ بلاول ہاؤس جارہی تھی جہاں بھٹو شہید کے بڑے صاحبزادے مرمرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد تعزیتی اجلاس عام رکھا گیا تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو اپنی والدہ کے ہمراہ اسٹیج پر موجود تھیں دونوں ماں بیٹی کی آنکھیں روتے روتے سوج چکی تھیں۔ پورا گراؤنڈ خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جہاں کثیر تعداد لیاری کی خواتین کی تھی جو اپنے شہید رہنما کے لیے حد درجہ افسردہ تھیں۔

میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل اور وہ بھی اپنی بہن کے دور حکومت میں بہت بڑا المیہ تھا۔ بی بی تھیں تو وزیراعظم پاکستان لیکن تھیں تو ایک بہن انھیں اپنی والدہ کو بھی دیکھنا تھا حکومت کا اتار چڑھاؤ بھی ان کے پیش نظر تھا۔ سیاسی مفادات کے حصول کے لئے حکومت سے زیادہ اپوزیشن سرگرم عمل تھی۔ دونوں اپنی متعین کردہ سمتوں پر چل رہے تھے ریاست اور عوام کی فکر ایسے میں کس کو ہوتی ہے لیکن تاریخ اپنے صفحات پر یہ حقیقت ضرور قلم بند کرے گی کہ اتنا بڑا غم کا کوہ گراں گرنے کے بعد بھی بینظیر جیسی زیرک ساستدان کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی سیاسی ریشہ دوائیوں کا تسلسل اب بھی جاری تھا

کام ہمارے ساتھ، چمچہ گیری دوسری پارٹیوں کی

حکومت کسکی تھی حکومت چلا کون رہا تھا۔ یہی وقت تھا بی بی جو حالات کے تھپیڑے کھا چکی تھیں اب بھی اپنی آواز بلند کررہی تھیں۔ اُن کے آنسو رواں تھے لیکن اس وقت بھی اپنی ملک وقوم کی فکر کھائے جارہی تھی۔

فضا بہت سوگوار تھی۔ شیر سا جوان میر مرتضیٰ بھٹو اپنے گھر کی دہلیز پر قتل کردیا گیا تھا کونسی آنکھ تھی جو اشکبار نہ تھی۔ ان حالات میں میں نے بیگم نصرت بھٹو کو صبر کی اعلیٰ منزل پر دیکھا جو اپنے جوان جہان بیٹے کے قتل پر سکتے کی حالت میں خاموشی کی چادر اوڑھے آنکھوں سے لہو برسا رہی تھیں۔ یہ بھی بڑی المناک گھڑی تھی کہ اس وقت سوائے ماں بیٹی وہاں بھٹو فیملی کا تھا کون؟ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں بلاول ہاؤس کے اندر جا چکی تھیں۔ مجمع چھٹ رہا تھا۔ قاتل کون تھا جس نے اتنی سفاکی سے ماں سے اس کا شیر جیسا بیٹا چھین لیا تھا۔ وقت کا کام تو گزرنا ہے گزر ہی جاتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور باور کروادیتا ہے کہ جو کچھ آج بویا ہوگا وہ کل کاٹنا بھی پڑے گا کیا قدرت کا انتظام ہے۔ بی بی کی اپنی حکومت اور یہ کوہ گراں، یقیناً صبر کی پیکر بینظیر بھٹو نے ہر کوشش ضرور کی ہوگی قاتل کی تلاش کرنے کی لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ قاتل مافیا ہمیشہ کبھی پس پردہ چلی جاتی ہے۔ اس کے خون سے رنگین ہاتھ دستانے پہنے معصوم چہرہ لئے تعزیت کرنے والوں میں سرِ فہرست ہوتے ہیں۔

یوں ہوا بھٹو کہ شہید کی پیپلز پارٹی تقسیم ہوتی چلی گئی، کون اپنا تھا کون پرایا، کون اصلی کون نقلی۔

مفاد پرست عناصر پھر دندناتے میدان میں اُتر آئے اور سیاسی مفاد پرستی کے ہر حربے استعمال کرنے لگے۔

عبداللہ شاہ کے دور کا دوسرا اہم قتل جیّد اور بے باک صحافی ماہ نامہ تکبیر کے مدیر صلاح الدین کا تھا۔ جب سچ کا گلا گھونٹ دیا گیا اور صحافت پر شبِ خون مارا گیا۔

پاکستان میں شاذ و نادر ہی ایسے صحافی ہیں جو لکھنے پڑھنے اور علمی وفکری صلاحیتوں کے قلمی اظہار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ صلاح الدین مرحوم ایک معروف سیاسی، سماجی سوچ کے علمبردار تھے ان کی کاٹ دار تحریریں سچ کا بول بالا برملا کرتی رہتی تھیں جو اس مفاد پسند دنیا کے لئے زہرِ ہلاہل ثابت ہورہی تھیں وہ مسلسل بتا رہے تھے۔

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔ ان کا یہ جرم بہت بڑا تھا۔ آئینہ ان کو دکھایا تو بُرا مان گئے'' کے مصداق ان کا قتل ان کی صحافتی، سماجی اور سیاسی جدوجہد کا قتل تھا۔

مفادات کا ٹکراؤ، جمہوری جڑوں کو کمزور کرنے والے، سیاسی کلاکار، سیاسی بیوپاری اس وقت مشترکہ مفادات کی چھت تلے اکٹھے ہوجایا کرتے ہیں جب ان کی دم پر پاؤں رکھ دیا جائے۔

اور اس کے نتیجے کے طور پر اہل قلم کے سر قلم کردیئے جاتے ہیں۔

سندھ میں بحرانی طوفان امڈا چلا آرہا تھا۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال ابتر ہوچکی تھی۔ اس دوران ہماری دفتری مصروفیات زیادہ ہی بڑھتی جارہی تھیں۔ ہر طرف بوری بند لاشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ کراچی شہر کو آسیبی سناٹے نے گھیرا ہوا تھا۔ کراچی کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں روز کی بنیاد پر بوری بند لاشیں نہ مل رہی ہوں مشترکہ مفادات پسند اکٹھے ہوگئے تھے جو سیاسی میدان مارنے پر تُل گئے تھے۔ جن گھروں کے چراغ گل ہورہے تھے ان کے آنسو پوچھنے والا

بہتر تھا کہ کسی خاتون کی بجائے میں کسی مرد وزیر کی پی آر او ہوتی

بھی کوئی نہ تھا۔ عجیب المیہ تھا MQM کے خلاف ریاستی آپریشن نے ملکی فضا مکدر کر رکھی تھی۔

اس دور کا ایک اور سفاک قتل سماجی رہنما حکیم محمد سعید کا تھا۔ جس نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہاں جبر، ناانصافی، مفاد پرستی، ریاستی دشت گردی نے انسان کو بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ حق وصداقت کی ہر آواز کو دبانے والے حربے انسانی رویوں کو برداشت نہ کرنے کی کوشش میں سانسوں کا جسموں سے تعلق ختم کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یزید بھی سمجھتا تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی سیکڑوں ہزاروں نسلیں حسین زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہیں۔ حسینیت آج بھی کامیاب ہے یزید کا نام ونشان مٹ چکا ہے وہ صرف جبر وتشدد کی علامت ہے۔

میں بیگم عزیزہ جیلانی کی وہ تمام کاوشیں جو وہ بہبود آبادی کیلئے کر رہی تھیں عوام الناس تک پہنچانے کیلئے تندہی سے مشغول تھی تب ہی ایک دن جب صبح صبح میری ملاقات بیگم جیلانی سے ہوئی تو اُن کا موڈ بہت خراب پایا۔ ایسا موڈ اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا وہ ہمیشہ محبت واحترام کے ساتھ ہی مجھ سے ملا کرتی تھیں۔ لیکن آج یہ کیا ہے بس مخمصے میں پڑ گئی اگلے ہی لمحے وہ بڑے غصیلے لہجے میں مجھ سے مخاطب تھیں۔

''تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں ہمارے ساتھ کام کر رہی ہو اور دوسری سیاسی پارٹیوں کی چمچہ گیری کرتی ہو''

وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں ''کل تم نے ائرپورٹ پر وسیم سجاد کا استقبال کس Capacity میں کیا'' یاد رہے اس وقت وسیم سجاد سینٹ کے چیئرمین تھے۔ وہ مزید پتہ نہیں کیا کیا بولے چلے جا رہی تھیں۔ اور میں اپنے اوپر عائد کئے جانے والے الزامات کی بارش میں سر اٹھانے کے بھی لائق نہ رہی تھی۔ میں ابھی پوری طرح سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ وہ مزید گویا ہوئیں، ''میں تمہاری ساری حرکتیں تمہارے سیکرٹری سے discuss کروں گی تم پیپلز پارٹی سے کھلواڑ کر رہی ہو'' وغیرہ وغیرہ۔ وہ شدید غصے کے عالم میں تھیں مجھے اپنی صفائی میں کچھ بولنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہ رہی تھیں۔ شاید انھیں یقین ہو چلا تھا کہ میں کچھ بولوں گی جھوٹ ہوگا۔ مجھے ناکردہ گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا تھا۔

مرتضیٰ بھٹو کے غم میں بہن اور ماں کی آنکھیں سوج چکی تھیں

اتنے بے بنیاد الزام جن کا سر نہ پاؤں میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو بولنے کیلئے آمادہ کیا لیکن ان کا غصہ مجھ پر غالب آ گیا۔ اب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو چکے تھے جو فقط میری سچائی کا ترجمان تھے کوئی دوسرا سہارا نہ تھا۔

وہ دن گزارنا میرے لئے سخت ترین تھا۔ اگلے دن پھر میں ان کے سامنے حاضر تھی۔ آج وہ نسبتاً بہتر تھیں لیکن ظاہر ہے میرے اوپر جو گزر چکی تھی اس کے اثرات تادیر میرا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ آج میں معمول سے زیادہ خاموش تھی۔ تب ہی انھوں نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑ دیا۔

خواتین کے لیے تعلقاتِ عامہ ایک مشکل کام تھا

''دیکھو بی بی کل جو کچھ میں نے تم سے کہا اس کے لئے مجھے کئی فون آئے تھے جس کے ذریعے مجھے ساری تفصیل پتہ چلی اور یہ سب کچھ ایک سرکاری افسر کے لئے قابل تعزیر ہے۔ ہماری پارٹی کو چھوڑ کر تم کسی اور سیاسی شخصیت کو کیسے انٹرویو کر سکتی ہو'' میں نے آج پھر اپنے آپ کو یکجا کیا اور بڑی ہمت کے ساتھ جواب دیا۔

''میڈم آپ مجھے بھی تو بولنے کا موقع دیں کہ کیا سچ ہے اور کیا غلط''

وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھیں گو یا میری چالاکیوں اور مکاریوں کو میرے چہرے پر تلاش کر رہی تھیں۔ ''میڈم یہ کوئی پہلا واقعہ اور پہلا فون نہیں ہے دفتر میں ایک خاتون اس سلسلے میں خاص شہرت رکھتی ہیں جو مختلف لوگوں کو فون کے ذریعے ہراساں کرتی رہتی ہیں۔ آپ دفتر سے اس کی تصدیق کروا سکتی ہیں۔ اب وہ مجھے سننے کو تیار تھیں تب ہی میں نے انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ ''میں نے سوائے اخباری تصویر کے وسیم سجاد کو کبھی دیکھا تک

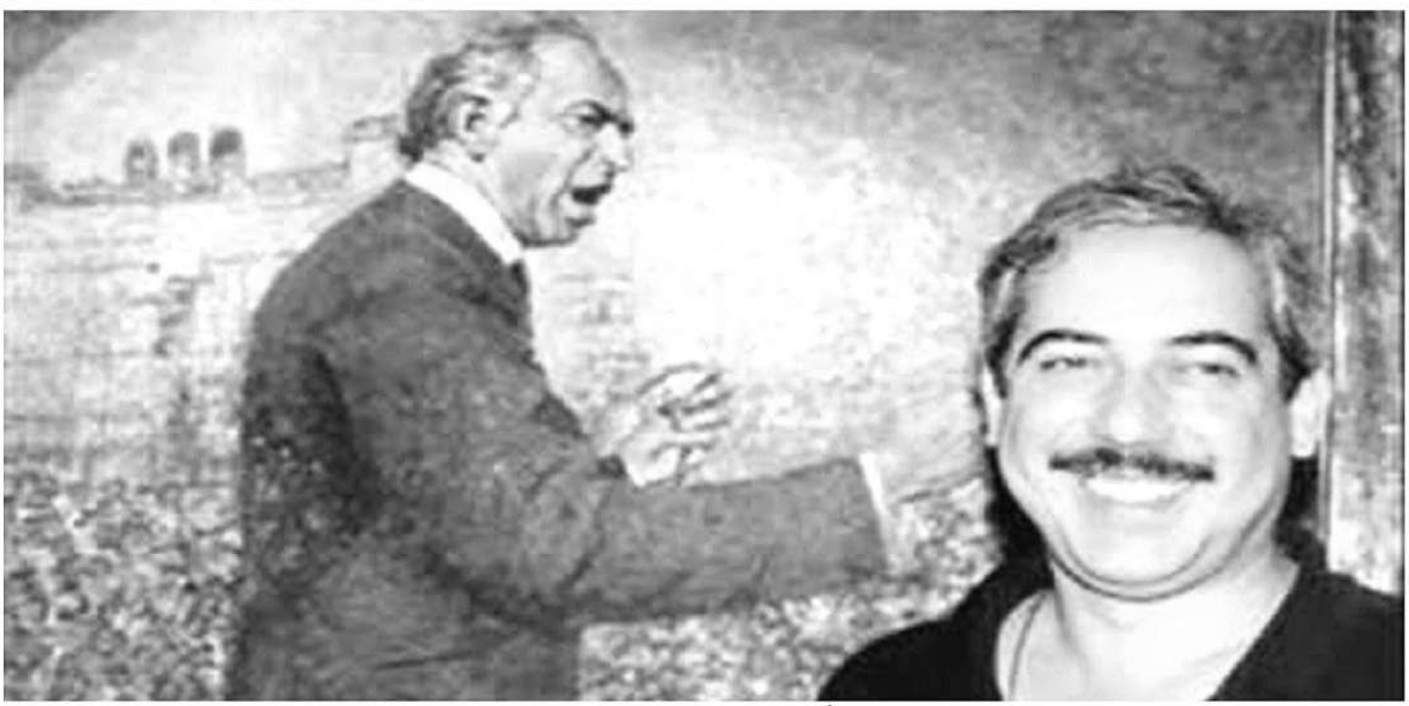

نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اُن کا انٹرویو اور ان کو ویلکم کرنا۔ یہ سب بے بنیاد الزام اور سراسر جھوٹ ہے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اب کچھ کچھ سمجھ پا رہی تھیں۔

''اس کی زد پر وہ کبھی خود بھی تو آ سکتے ہیں
یہ کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے

بیگم بھٹو سکتے کے عالم میں رو رہی تھیں

مجھے سنے تب ہی میں نے پھر اپنی ہمتوں کو یکجا کیا اور کہا'' میڈم اس

صاحبہ کے حضور پیش کیا لیکن وہاں سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔ وہ

میرے خلاف جو آگ لگائی گئی تھی وہ بھڑکتی جا رہی تھی۔ میں بظاہر سندھ کی صوبائی مشیر بہبود آبادی کے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔ ان کی

ثنا اللہ راجڑ کے قلم کا تڑکا ہر تحریر غلطیوں سے پاک کر آتا

شخصیت کا یہ پہلو پہلی دفعہ میرے سامنے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے بدگمان تھیں اس دن بھی انھوں نے اپنے کسی پروگرام کے بارے میں مجھ سے شیئر نہیں کیا۔ میں خاموشی کا بُت بنی اگلے مرحلے کا انتظار کر رہی تھی۔ بظاہر سرکاری روایت اور پالیسی تو یہی بتاتی تھیں کہ مجھے مختلف الزامات کے ساتھ واپس دفتر بھیج دیا جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

اگلے دن ایک اور دھماکہ ہوا پچھلے دنوں جاری کی گئی تصویر کا کیپشن اخبار والوں کی غلطی کی وجہ سے بیگم جیلانی کے خلاف جا رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا میں مرتی تو نہ کیا کرتی۔ انھوں نے بچا کھچا غصّہ مزید مجھ پر اتارنا شروع کر دیا۔ ''تم یہ کیا حرکتیں کر رہی ہو'' میں سب سمجھ رہی ہوں اب تم خبریں بھی میرے خلاف لگا رہی ہو'' مجھے یقین آ گیا کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ وہ مجھے بُرا بھلا کہے جا رہی تھیں۔ بغیر

میں ذرہ برابر بھی میرا دخل نہیں ہے یہ اخبار کے اسٹاف کی غلطی ہے میں خود اس کی تردید کرواؤں گی آپ اطمینان رکھئے۔ وہ غصے میں ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔

میں حیران پریشان یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ناکردہ گناہوں کی سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔ اس دن شدّت سے مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس سے اچھا تھا کہ میں کسی مرد وزیر مشیر کی افسر تعلقات عامہ ہوتی تو یہ صورتِ حال دیکھنے کو نہ ملتی۔ بعد میں ہونے والے تجربات نے میری اس بات کی تصدیق کر دی کہ مرد اس طرح کے مسائل کو بہتر طریقے سے ڈیل کر لیتے ہیں جب کہ خواتین اپنے جذباتی پن اور انا کی وجہ سے ایشوز کو مزید بگاڑ دیتی ہیں۔

میں اسی دن شام کو متعلقہ اخبار کے دفتر پہنچی اور اس غلطی سے آگاہ کیا۔ اگلے دن اس کی تردید کی درخواست کرتے ہوئے گھر تو واپس آ گئی لیکن پوری رات پریشانی میں کٹ گئی اگر کل یہ Rebuttal شائع نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔ بہر حال جیسے تیسے صبح ہوئی اور اطمینان ہوا تردید معذرت کے ساتھ شائع ہو چکی تھی۔ میری جان میں جان آئی اللہ نے میری عزت رکھ لی۔ خبر کا تراشہ بیگم

اب بھی مسلسل خاموش تھیں ایسا لگ رہا تھا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔ اب جو بھی ہو میں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی امید تھی انھیں کچھ اطمینان ضرور ہوا ہوگا۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو اس وقت اس کا کوئی اظہار مجھے نظر نہ آیا۔ میں بڑے دکھ بھرے احساسات کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی تو دو تین اخبار نویسوں کو اپنا منتظر پایا۔ تب ہی وہ مجھے دیکھتے ہی گویا ہوئے'' میڈم معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے؟ اب تو سب خیریت ہے نا؟ وغیرہ وغیرہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا اندر کی کہانی دور دور تک پھیل چکی ہے انھیں شاید اپنے اخبار کے لئے مزید کسی سنسنی خیز خبر کا انتظار تھا۔

بیگم جیلانی کا مزاج آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا۔ وسیم سجاد والی بات کا کیا ہوا مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ میں آخر ان کو کس طرح یقین دلاتی کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں ہے یہ تو دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہے۔ لیکن پھر انھوں نے اس پر کوئی بات نہ کی میں بھی معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف ہو چکی تھی وہ بھی ہمیشہ کی طرح اپنے آئندہ کے پروگرام سے مجھے گاہے بگاہے آگاہ کر رہی تھیں۔

(جاری ہے) ۞

”غزالہ خالد کی کتاب ''اَن کہی'' نے پرنٹ اور ڈیجیٹل میں پیوندکاری کی۔ وہ ورقی میڈیا اور برقی میڈیا دونوں میں مقبول ہیں۔ ہماری درخواست پر وہ ہر مہینے Feel Like کے تحت مہینے بھر کی تلخ و شیریں خبروں پر قلم اٹھاتی ہیں۔ نہ کہتے ہوئے بھی بہت سی باتیں کر جاتی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

پاک سعودی دوستی، مودی بھی پریشان

تحریر: غزالہ خالد

ماہ ستمبر میں ایک دن اچانک خبر آئی کہ اسرائیل نے قطر کے فوجی اڈوں پر حملہ کر دیا ہے صرف مسلم دنیا میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ان حالات میں ہم پاکستانی تو ویسے بھی صرف یہی دوڑا سکتے تھے سو ہم نے تو خوب ہی دوڑائی اور جب ہم دوڑاتے دوڑاتے اور تشویش کی لہر دوڑتے دوڑتے تھک گئے تو خاموش ہو کر آرام سے بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟

خیر پھر بارش، سیلاب اور اس تشویش کی لہر کے فوراً بعد ماہ ستمبر کی 17 تاریخ سے ملک عزیز میں خوشیوں کے ترانے بجنے شروع ہوئے اور پاک سعودی دوستی کی دھوم مچ گئی۔

پاکستان تو ''لا الہ الا اللہ'' کے نعرے کی بنیاد پر ہی وجود میں آیا تھا اس لئے الحمدللہ سعودی عرب سے تو ہمیشہ تعلقات اچھے رہے اور دوستی قائم رکھی گئی وہ تو کچھ مودی اور شہزادہ محمد بن سلمان کی قربتوں سے "Feel like" اجنبیت ہو رہی تھی لیکن اب تو جناب مبارک ہو کہ سب خدشات دور ہوئے اور اب ہم دونوں کی پکی دوستی ہو گئی ہے۔

سنا ہے کہ اس دوستی سے مودی بھیا کچھ پریشان ہیں ہونا بھی چاہیئے کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ ایک دفاعی معاہدہ ہے اور دفاعی معاہدے دشمن ممالک کو فکر مند تو کرتے ہی ہیں۔ معاہدے کی شقیں آپ سب نے بھی پڑھی ہوں گی لیکن سچی بات ہے ہم نے نہیں پڑھیں صرف پہلی شق پڑھی اور وہی اتنی پسند آئی کہ آگے پڑھنے کا دل ہی نہیں چاہا۔

پہلی شق پڑھتے ہی ہمیں اپنا اسکول کا زمانہ یاد آ گیا جب ہم چھوٹے تھے تو اسکول میں ایسا ہی ہوتا تھا کہ اگر ہماری پکی سہیلی کی کسی سے "کٹی" ہو جاتی تھی تو ہم بھی اس نا ہنجار دشمن بچی سے بغیر لڑے ہی "کٹی" کر لیا کرتے تھے کہ ہماری سہیلی کا دشمن ہمارا دشمن!

تو جناب دفاعی معاہدے کی پہلی شق بھی یہی ہے کہ اگر دونوں ملکوں میں سے کسی ایک پر بھی حملہ ہوا تو وہ حملہ دونوں ملکوں پر حملہ تصور کیا

جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ہم بچپن میں یہی کیا کرتے تھے لیکن آپس کی بات ہے ہمارا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہماری سہیلیاں بدلتی رہتی تھیں۔

ویسے تو خارجہ پالیسی میں بھی کچھ حتمی نہیں ہوتا یعنی ہر دوستی "پ" سے پکی نہیں ہوتی بلکہ وقت ضرورت کچھ "ک" سے کچی دوستیاں بھی کر لی جاتی ہیں جو آگے جا کر وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے "تڑک" سے ٹوٹ بھی جاتی ہیں لیکن نہیں نہیں!! آپ لوگ غلط نہ سمجھ جانا ہم حالیہ پاک سعودی دوستی پر بالکل بھی شک نہیں کر رہے یہ تو بات ہی الگ ہے اور پاکستان کے لئے ایک بڑی کامیابی بھی ہے جو پاک فوج کے تعاون سے ممکن ہوئی ہے۔ ہم سعودیوں کے" محافظ" بنے ہیں اور بدلے میں وہ ہمارے "معاون" بنے ہیں تو ان شاءاللہ یہ دوستی تو چلے ہی چلے لیکن ایک بات ہماری کمزور عقل میں اب تک نہیں آئی کہ اس دوستی سے عام عوام کو بھی کچھ فائدہ ملے گا یا نہیں یہ بھی بتا دیا جاتا تو عوام مزید خوش ہو جاتے۔

بچپن سے اب تک کبھی "پاک چین دوستی نان پوئے" سن کر خوش ہوتے تھے تو کبھی" پاک ترک دوستی زندہ باد" کے نعرے لگتے

امریکہ ہمیشہ باس، بھارت سدا دشمن

تھے۔کبھی "پاکستان اور جاپان" ایکدوسرے کے گلے میں ہار ڈالتے تھے تو کبھی ملائیشیا سے معانقے پر معانقے ہوتے تھے۔اسی طرح افغانی کبھی بھائی بن جاتے تو کبھی دشمن لیکن ہاں امریکہ ہمیشہ سے" باس" ہے اور رہے گا جب کہ ہندوستان تمام کوششوں کے

باوجود دشمن کا دشمن ہی رہا چلیں چھوڑیں ہم تو بات کر رہے تھے پاک سعودی دفاعی معاہدے کی تو اب دیکھتے ہیں کہ یہ "حبیبی حیا حیا" کب تک چلتا ہے اور اس کا کچھ فائدہ ان مجبور و بے بس مسلمانوں کو بھی ہوتا ہے جو بے یارو مددگار بھوک، پیاس اور بمباری برداشت کر رہے ہیں اور ڈٹے ہوئے ہیں دل سے دعا ہے کہ کاش ہم کبھی ان کی حفاظت کرنے کے قابل بھی ہوسکیں۔

ادھر ملک کی حالت سیلاب کی وجہ سے ابھی تک خراب ہے چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہات زیر آب عوام پریشان اور حکومت حسب معمول امداد کی منتظر یا ٹک ٹاک بنانے میں مصروف۔

ارے یاد آیا کہ کبھی کشکول توڑنے کی باتیں بھی تو ہوا کرتی تھیں۔ واقعی ہر دور کے سنہرے خواب الگ الگ ہوتے ہیں اللہ جانے یہ کشکول اصل میں کب ٹوٹے گا؟ ابھی تو پورا ملک اسی کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔ پرانے زمانے میں عوام سیدھے سادھے ہوتے تھے اب تو اتنے چنٹ و چالاک ہوگئے ہیں کہ مصیبت کے بعد وزیروں کے بیرون ملک دوروں سے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ کیوں جایا جارہا ہے اور پھر سوال بھی پوچھتے ہیں کہ ہاں بھئی کیا ملا؟؟ حالانکہ وہ بیچارے حکومتی اراکین اپنے لئے مانگنے تھوڑی جاتے ہیں عوام کی خاطر کاسہ اٹھاتے ہیں اب عوام کو ہی قدر نہیں تو کیا کیا جاسکتا ہے۔

عوام تو ہر دورے کو شک کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں بس اللہ ہی ہمیں اس مشکل سے نکلنے کی ہمت وطاقت دے آمین۔

امریکی ویزے کے حوالے سے ان کی پالیسیاں جاری ہیں اور ستمبر میں ایچ ون ویزے کی وجہ سے ہندوستان میں افراتفری مچی رہی ہم پاکستانی تو اس سے بچے رہے کیونکہ ہمارے ملک میں ایچ ون ویزہ رکھنے والوں کی پرسنٹیج آٹے میں نمک کے برابر ہے جب کہ انڈیا میں" آٹا ہی آٹا" ہے اس لئے وہاں بھاگ دوڑ بھی زیادہ رہی

-خبریں سن کر اور ہندوستانیوں کی پریشانی دیکھ کر ہمیں تو خوشی ہو رہی تھی کیونکہ انہیں تاریخوں میں میچ بھی چل رہے تھے۔ارے کرکٹ میچ میں ہرا دیا تو کونسا تیر مار لیا دیکھو اللہ بدلہ لے رہا ہے ویزے کے لئے کیسے خوار ہو رہے ہیں ہوا اچھا ہوا بہت اچھا ہوا۔

عوام ہر چیز کا قصوروار حکومت کو ہی ٹھہراتے ہیں کرکٹ میچ کھلاڑی برا کھیل کے ہار رہے ہیں تو حکومت قصوروار کہاں سے ہوگئی؟ حکومت نے بھی لگتا ہے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور اب پوری توجہ باڈی بلڈنگ پر مرکوز کر دی ہے۔ باڈی بلڈنگ فیڈریشن کے نئے چیئرمین مقرر کردئے گئے ہیں۔ یہ تقرر اتنا سوچ سمجھ کے کیا گیا ہے کہ لگتا ہے کہ اب ہر گھر سے پے در پے" باڈی بلڈرز" برآمد ہوا کریں گے۔

جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں اس کے چند دن بعد ہی ستمبر کے آخری ہفتے میں جنرل اسمبلی کا اجلاس متوقع ہے جس میں شرکت کے لئے ہمارا ایک بڑا وفد گھومنے پھرنے جانے کے لئے تیار ہے۔ایسی بات نہیں ہے کہ سب گھومنے پھرنے ہی جارہے ہیں کچھ کام کی بات

پڑھنے والے سنی سنائی پر یقین کریں یا نہیں

کرنے والے بھی ہیں اور وہ آج کل محنت کر رہے ہیں کہ جنرل اسمبلی میں بہترین طریقے سے اپنی بات پہنچا سکیں لیکن پھر بھی سنا ہے کہ وفد بہت بڑا ہے جس کی ضرورت نہیں تھی ٹی وی کی بات چیت کے گرما گرم شو میں تو یہی بتا رہے تھے اب پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ! ہمیں کیا پتہ ہم نے تو وہیں سنا تھا۔

جو لکھتے ہیں وہ سنتے ہی تو ہیں اس لئے سنی سنائی بھی لکھ دیتے ہیں اب پڑھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ سنی سنائی پر یقین کرلیں یا ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتے رہیں۔

"ہم تو جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے" ❁

عاصم متین خان امریکہ میں اطراف کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر نے انتہائی اہم موضوع پر اپنا مکتوب ارسال کیا ہے ستمبر کے مہینے میں اقوام متحدہ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوتا ہے۔ اس میں سب ممالک کو اظہارِ خیال کا موقع ملتا ہے۔ عام طور پر تو اسے ایک رسمی اجلاس ہی کہا جاتا ہے۔ مگر اس سال اسرائیل کی بربریت کے تناظر میں یہ اجلاس اہم اور سنگین ہو گیا ہے۔ عاصم متین خان یو این او کے ایجنڈے پر اہم مسائل کی فہرست بھی دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ممالک کا کیا رویہ رہتا ہے۔ اس کا بھی ذکر کر رہے ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔

اقوامِ متحدہ کی تاریخ کا جنرل اسمبلی کا اہم اجلاس

تحریر: عاصم متین خان

امریکہ میں 'اطراف' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر

جب آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے اس وقت تک نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سالانہ اجلاس شروع ہوئے چند روز گزر چکے ہوں گے۔

اس اجلاس میں دنیا بھر کے لیڈران سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور دنیا کے اہم مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ انہی مسائل کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے جن سے دنیا کی بڑی طاقتوں کے مفادات منسلک ہوتے ہیں۔ باقی مسائل کا سرسری جائزہ ہی لیا جاتا ہے۔

تمام سربراہان مملکت کو اس اجلاس سے خطاب کرنے کا موقع بھی ملتا ہے اور وہ اپنے ممالک کے اور علاقے کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں لیکن اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب چھوٹے ممالک کے سربراہان مملکت جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہیں تو بعض اوقات جنرل اسمبلی کے ہال میں نہ ہونے کے برابر سامعین بیٹھے ہوتے ہیں لیکن جب بڑی طاقتوں کے سربراہان مملکت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے شروع کے دو تین دن میں خطاب کرتے ہیں اس وقت تمام دنیا کے سربراہان مملکت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جنرل اسمبلی کے ہال میں موجود رہیں۔

اگرچہ دنیا بھر کے تمام مسائل کا کم از کم ذکر تو یہاں ضرور ہوتا ہے تاہم ان مسائل کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر کشمیر اور فلسطین سمیت چند دیگر مسائل ستر پچھتر سالوں سے موجود ہیں اور ان کا ذکر بھی سال میں کئی بار ہوتا ہے اور ان مسائل پر متعدد قراردادیں بھی اقوام متحدہ کی میز پر موجود ہیں تاہم ان مسائل کے حل کے لیے عملی طور پر کوئی کوشش آج تک نہیں کی جا سکی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر اور فلسطین میں جاری ظلم اور بربریت کے نتیجے میں اگرچہ لاکھوں معصوم بچے خواتین اور مرد شہید ہو چکے ہیں اور دنیا بھر میں موجود فلسطینی اور کشمیری دنیا بھر کا ضمیر جگانے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں لیکن آج تک فلسطینیوں اور کشمیریوں کی کئی نسلیں اس امید میں دنیا سے چلی گئیں کہ شاید انہیں بھی اپنے وطن میں ایک آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

یوکرین اور روس کی جنگ کے نتیجے میں روس اور امریکہ کے تعلقات میں کشیدگی میں بھارت کے روس نواز رویئے نے امریکہ کو بھارت سے ناراض کر دیا ہے اور صدر ٹرمپ متعدد بار اپنی اس ناراضگی کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں اور انہوں نے پچھلے چند دنوں میں بھارت کو سزا دینے کے لیے بھارت سے آنے والی امریکہ میں درآمدات پر بھاری ٹیرف بھی عائد کر دیا ہے۔ دوسری جانب ایسا بھی ہے کہ بھارت کو مزید سزا دینے کے لیے تاریخ میں پہلی بار کسی امریکی صدر نے کشمیر کے مسائل پر پاکستان کی حمایت کا اعادہ بھی کیا ہے پاکستان کے ساتھ امریکہ کی بڑھتی ہوئی پینگوں کے نتیجے میں پاکستان کے آرمی چیف فیلڈ مارشل عاصم منیر کو حالیہ مہینوں میں دو دفعہ امریکی صدر ٹرمپ سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ اگرچہ ان ملاقاتوں میں زیر غور آنے والے معاملات کی تفصیلات تو پتہ نہیں تاہم یہ ضرور نظر آ رہا ہے کہ امریکہ کی پاکستان پر نظر کرم بغیر کسی بڑی وجہ کے نہیں ہو سکتی اور یہ بڑی وجہ کیا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ تاہم قیاس آرائیاں ہیں کہ امریکہ پاکستان سے اس بات کے لیے تو وعدہ کر رہا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوششیں کرے گا اور بھارت پر دباؤ بھی ڈالے گا اس کے بدلے میں شاید امریکہ کو مشرق وسطی کے سب سے بڑے مسئلے فلسطین کے لیے پاکستان کی حمایت درکار ہوگی۔ حالیہ دنوں میں یورپ کے کئی ممالک نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ وہ ستمبر میں فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیں گے۔ مشرق وسطی کے چند ممالک پہلے ہی اسرائیلی ریاست سے تعلقات استوار کر چکے ہیں اور اب سعودی عرب اور دیگر مشرق وسطی کی ریاستوں پر دباؤ ہے کہ وہ بھی مشرق وسطی میں اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم کر لیں لیکن خارجہ امور کے ماہرین کا کہنا ہے کہ سعودی عرب ابھی بھی گومگوں کی کیفیت میں ہے اور اس کے فیصلہ کرنے کی ہچکچاہٹ یہ ہے کہ پاکستان بھی اسرائیل کو تسلیم کر لے کیونکہ پاکستان کو اسلامی ممالک میں اور علاقے میں ایک

کشمیر اور فلسطین کے مسائل سات دہائیوں سے اپنے حل کے لیے تڑپ رہے ہیں

اہم حیثیت حاصل ہے اور جب تک پاکستان اسرائیل کی ریاست کو تسلیم نہیں کرتا اس کی وجہ سے سعودی عرب کو بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے سے مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے اور خیال یہی ہے کہ اس وقت پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری کی ایک بڑی وجہ پاکستان کو اس بات پر تیار کرنے کے لیے ہے کہ پاکستان بھی اسرائیلی ریاست کو تسلیم کر لے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پاکستان کے اس فیصلے کے بعد امریکہ اور یورپ مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق حل کرنے کے لیے کتنے مخلص رہیں گے۔

اگر سعودی عرب اور پاکستان اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کر لیں گے تو

کیا سعودی عرب اور پاکستان اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرلیں گے؟

شاید مشرق وسطی میں مستقبل قریب میں ایک فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں آجائے لیکن کیا وہ ریاست حقیقتاً فلسطینی عوام کی امنگوں کے مطابق ہوگی یا وہ امریکہ اور یورپ کی من پسند ہوگی اور علاقے میں امریکہ یورپ اور اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک گارنٹی ہوگی۔ کیونکہ پچھلے چند سالوں میں فلسطین سمیت پورے مشرق وسطی اور دیگر ممالک میں حماس کی لیڈرشپ سمیت متعدد فلسطینی قوم پرستوں کو اعلانیہ اور غیر اعلانیہ شہید کیا جا چکا ہے۔

بحر حال مسئلہ یہ ہے کہ اب پاکستان میں رائے عامہ کو کس طرح سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے فیصلے کے لیے تیار کیا جاتا ہے جو پاکستان کی برسہا برس کی اصولی خارجہ پالیسی کے خلاف ہے یہ آئندہ چند دنوں میں دیکھا جائے گا خاص طور پر خادم حرمین شریفین کے اسرائیلی ریاست کے تسلیم کرنے کے بعد ہمیں شاید یہ سمجھایا جائے گا کہ یہ اب ہمارا ایک دینی فریضہ ہے کہ ہم بھی آنکھیں بند کر کے سعودی فیصلے کی توثیق کردیں اور یہ سب بھول جائیں کہ حالیہ چند مہینوں کی اسرائیلی بربریت کے نتیجے میں ہزاروں فلسطینی اپنی جان کی بازی ہار چکے ہیں اور اس وقت غزہ میں انسانیت جس طرح سے دم توڑ رہی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسرائیلی بربریت کے خلاف یورپ اور امریکہ کے عوام بھی سڑکوں پر نکل آئے ہیں ان کا ضمیر بھی انہیں ملامت کر رہا ہے کہ آج کے اس جدید دور میں اس طرح کی ننگی بربریت ناقابل قبول ہے تاہم مسلم امہ کا تصور کتابوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آرہا اور اسلامی ممالک آج بھی سو رہے ہیں اور بہت کچھ کھو بھی رہے ہیں! قطر پر ہونے والے اسرائیلی حملے کے بعد ہونے والی دوحہ کانفرنس زبانی جمع خرچ اور مذمت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

عام طور پر پاکستان سے جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستانی وزیر اعظم نیویارک تشریف لاتے ہیں یا پاکستان کے دیگر ارباب واختیار میں سے کوئی پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔

جتنے دن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا سالانہ اجلاس نیویارک میں جاری رہتا ہے اس دوران ہر روز اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے باہر متعدد ممالک کے نیویارک میں موجود تارکین وطن اپنے وطن کی حمائت میں اور دشمن ملک کے سربراہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کی مخالفت میں بھرپور مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی صورتحال اس وقت بھی نظر آتی ہے جب بھارت کے وزیر اعظم جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہیں تو نیویارک کے اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے باہر سینکڑوں پاکستانی اور کشمیری بھی کشمیر اور فلسطین کی حمایت میں بھارت کے وزیر اعظم کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں۔

کچھ عرصے سے خالصتان کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے سکھ بھی پاکستان کے ساتھ بھارت کے خلاف مظاہرے میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جس دن پاکستان کے وزیر اعظم کو خطاب کرنا ہوتا ہے اس دن اقوام متحدہ کے ہیڈکوارٹر کے باہر بھارتی تارکین وطن بھی کچھ واویلا کرتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے وزیر اعظم مسئلہ کشمیر پر اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہتے ہیں۔

اقوام متحدہ میں پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کی تقاریر کو کچھ غور سے ضرور سنا جاتا ہے۔ بلکہ پاکستان اور بھارت کے اقوام متحدہ کے مستقل نمائندے جب اقوام متحدہ میں خطاب کرتے ہیں تو ان کی تقاریر کو بھی غور سے سنا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں دو مقررین کی تقریر سننے کے لیے اقوام متحدہ کی گیلریوں میں سامعین بھرے رہتے تھے اور نیویارک کی بڑی جامعات کے پروفیسر اپنے طلباء پر زور دیتے تھے کہ وہ اگر تاریخ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور تقریر کے فن کو سیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ پاکستان کے اور بھارت کے دو مقررین کی اقوام متحدہ میں تقاریر کو ضرور سنیں ان میں ایک پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو تھے اور دوسرے بھارت کے کرشنا مینن۔ مسئلہ کشمیر کو جس طرح سے ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں اجاگر کیا اور جس گرم جوشی کے ساتھ کشمیر کی آزادی کے لیے آواز اٹھائی شاید ہی کسی پاکستانی وزیر اعظم نے کبھی کیا ہو اور ذوالفقار علی بھٹو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اقوام متحدہ کی تاریخ میں طویل ترین تقاریر میں سے ایک تقریر بھی کی جو آٹھ گھنٹے سے زائد جاری رہی۔

سرد جنگ کے عروج کے دور میں روس کے خرشچیف ایک دفعہ اقوام متحدہ کے ایک اجلاس میں اس قدر غصے میں آگئے کہ انہوں نے ایک مقرر کی تقریر کی مخالفت میں کھڑے ہو کر اپنا جوتا غصے میں میز پر مارنا شروع کر دیا۔

اس وقت دنیا جن دیگر بڑے مسائل سے دوچار ہے اور اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر یہ مسائل زیر غور رہے ہیں وہ مختصر طور پر یہ ہیں:

* مسئلہ فلسطین اور مسئلہ کشمیر سمیت دنیا کے دیگر تنازعات کا دائمی پر امن حل۔
* ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات اور وجوہات کا تدارک اور بہتر آب و ہوا کے تحفظ کے لیے اقدامات۔ دنیا بھر میں پاکستان اس وقت ماحولیاتی تبدیلیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک ہے
* بھوک اور غربت کے خاتمے اور دنیا بھر کے لئے یکساں ترقی کے مواقع کی فراہمی
* بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی اور خلاف ورزیوں کے خلاف بھرپور آواز
* خواتین کو مساوی حقوق کی فراہمی
* دنیا بھر میں دہشت گردی کا خاتمہ، اگرچہ اقوام متحدہ دہشت گردی کی مخالفت کرتا ہے تاہم آج تک اقوام متحدہ دہشت گردی کی واضح اور متفقہ تعریف کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بڑی طاقتیں جس جدوجہد کو دہشت گردی کہتی ہیں وہ چھوٹے ممالک کی اپنے حقوق کے لیے اور قومی آزادی کی جدوجہد ہوتی ہے۔
* دنیا بھر میں جنگ اور اسلحے کی دوڑ کا خاتمہ
* دنیا بھر میں بہتر تعلیم کی فراہمی
* دنیا بھر کے تمام ممالک میں صاف پینے کے پانی کی فراہمی

یہ وہ مسائل ہیں جو برسوں سے اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہیں اور اقوام متحدہ کے تمام ممالک ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہے ہیں اور حالیہ چند سالوں میں تجزیہ نگار اقوام متحدہ کو ایک ناکام ادارہ قرار دیتے ہیں جو دنیا کے تمام ممالک کے مسائل کو مساوی بنیادوں پر حل کرنے میں ناکام رہا ہے اور بڑی طاقتوں کی اجارہ داری کا شکار ہے اور اقوام متحدہ کی ناکامی دنیا بھر کے چھوٹے

اقوامِ متحدہ کے ایجنڈے پر موجود اہم عالمی مسائل کیا کیا

ممالک کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے اقدامات اپنے تیئں کرلیں کیونکہ اقوام متحدہ صرف بڑی طاقتوں کے مسائل پر ہی غور کرتی ہے۔

جنرل اسمبلی کا اس دفعہ کا اجلاس شاید اقوام متحدہ کی تاریخ میں سب سے اہم اجلاس ہے اور دنیا بھر میں بڑھتا ہوا عوامی شعور اقوام متحدہ کی کاروائیوں پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے کہ اقوام متحدہ دنیا بھر کے مسائل کے حل کے لیے کس قدر سنجیدہ ہے اور عملی طور پر اس پوزیشن میں بھی ہے کہ وہ دنیا کے مسائل حل کرسکتی ہے یا وہ اسی راستے پر چل رہی ہے جس کے نتیجے میں لیگ آف نیشنز کا خاتمہ ہوا تھا لیکن اس اجلاس کے فیصلوں کے بعد دنیا بھر میں بڑی تبدیلیاں آئینگی! ❁

اطراف کی قلمی معاون جہاں آراء کو عمرے کی سعادت دوبارہ نصیب ہوئی تو ہم نے درخواست کی کہ وہ اس مبارک سفر کی روداد اطراف کے لیے قلمبند کریں تاکہ ہمارے قارئین بھی شریکِ سفر ہوسکیں۔ یہ اس سفر کی چوتھی قسط ہے۔ بہت ہی عقیدت سے اور خلوص سے ایک ایک حرف کی تدوین کی گئی ہے۔ اب مکّے سے ماشاء اللہ مدینے پہنچ گئے۔ ٹریول ایجنٹ کی غلط بیانی سے مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن اس مقدس سفر کی برکتیں دشواریوں پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

گنبدِ خضریٰ کے سامنے شکرانے کے نوافل ادا کیے

قسط 4

تحریر: جہاں آراء

اگلا دن ۱۱ اپریل جمعۃ المبارک کا تھا اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جمعہ کے دن لازمی عمرہ ادا کریں گے۔ یہاں ہمارے لئے تسلی بخش امر یہ بھی تھا کہ امی کو تھوڑا آرام مل گیا تھا پھر بھی ہم نے ان سے کئی بار پوچھا کہ اگر ان کی ہمت نہیں تو وہ جمعۃ المبارک کا عمرہ نا کریں لیکن انہوں نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا بلکہ کہنے لگی کہ جمعہ کا عمرہ تو افضل ہوتا ہے میں تو لازمی کروں گی، اور ہم تو پہلے ہی تیار تھے۔ لہٰذا اگلی صبح تقریباً نو بجے ہم نے مسجد عائشہؓ کا رخ کیا تاکہ وہاں سے احرام کی نیت کر کے عمرہ کی ادائیگی کے لئے جاسکیں۔ مسجد جانے کے لئے ہم نے کئی ٹیکسی والوں کو روکا لیکن ہر کوئی اپنی مرضی کا کرایہ مانگ رہا تھا۔ کرائے سے متعلق بھائی نے ہوٹل میں موجود کچھ لوگوں سے معلومات لے لی تھیں۔ جن کے مطابق مسجد عائشہؓ جانے کا کرایہ ۱۵ ریال تھا اور اگر ہم آنے جانے کی بکنگ کروالیں تو ۳۰ ریال لگیں گے۔ لیکن یہاں تو کوئی ۴۰ ریال مانگ رہا تھا تو کوئی ۵۰ ریال، ایک نے تو ۷۰ ریال کے لئے منہ کھولا جسے سن کر ہمارے منہ بھی کھل گئے اور ہمیں اس کی جانب سے اپنے منہ گھمانے پڑے۔ بالآخر ایک پاکستانی ڈرائیور ۳۰ ریال میں راضی ہوا۔ اور ہم نے شکر ادا کیا۔ مکہ مکرمہ کی زیارتوں کے دوران ہمیں مسجد عائشہ نہیں لے جایا گیا تھا۔ مسجد عائشہ کو مقام تنعیم بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ شہر سے مدینہ جانے والے راستے پر تنعیم کے مقام پر حدودِ حرم ختم ہو جاتی ہے۔ اس مسجد کی وجہ شہرت یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی مخصوص وجوہ کے باعث عمرہ ادا نہ کرسکی تھیں۔ حج کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس حسرت کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے انہیں ان کے بھائی عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اس مقام تک بھیجا جہاں سے انہوں نے احرام باندھ کر واپس کعبہ آکر عمرہ ادا کیا جب سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کعبے کی از سرِ نو تعمیر کی تو سب لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مقام تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ ادا کریں۔ مسجد عائشہ میں نوافل کی ادائیگی اور عمرے کی نیت کرنے کے بعد ہم حرم شریف پہنچے لیکن جمعۃ المبارک کے باعث مطاف میں اتنا ہجوم تھا کہ لوگوں کے سر سے سر جڑے نظر آرہے تھے۔ لہٰذا امی کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پھر ارادہ کیا کہ پہلی منزل ہی سے امی کو ویل چیئر پر طواف کروایا جائے۔ جس کے لئے ہم مطاف سے دوبارہ اوپر گئے اور طواف شروع کیا۔ آج پہلی منزل پر بھی غیر معمولی رش نظر آرہا تھا اسی لئے ویل چیئر کی رفتار بھائی نے کم ہی رکھی۔ طواف مکمل ہونے کے بعد صفا و مروہ کی سعی کی اور نوافل ادا کئے۔ اس کے بعد چونکہ نماز جمعہ میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اور اتنے وقت میں ہوٹل جا کر دوبارہ آنا کسی طور ممکن نہیں تھا لہٰذا ہم دوبارہ پہلی منزل پر ہی خواتین کی صفوں میں بیٹھ گئے جہاں سے کعبہ شریف بھی نظر آرہا تھا جبکہ بھائی مردوں کی صفوں کی جانب چلے گئے۔ یہاں ایک خاتون

تسبیح بانٹ رہی تھیں انہوں نے ہمیں بھی تسبیح دی۔ بس پھر تو کعبے پر نظریں جمائے ہم پورا وقت دعا مانگتے رہے۔ یہ بہت ہی سکون کا وقت تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میرا رب میری ساری سرگوشیاں بڑے دھیان سے سن رہا ہے اور میں تھی کہ سناتی ہی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ان لوگوں کا خیال بھی ذہن میں تھا جنہوں نے دعا کے لئے کہا تھا۔ اب سب کی فریاد بھی اللہ تک پہنچائی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس کی دعا مجھے اس در تک لے گئی تھی۔ اس لئے سب کے لئے دعا کرنا لازمی تھا کیا پتا کس کے صدقے میں اللہ ہماری بھی سن لے۔ اس کے ساتھ ہی ازان کے بعد جمعہ کا خطبہ شروع ہوا جو کہ مکمل عربی میں تھا۔ خطبہ کے دوران بات چیت کرنے کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ پورا خطبہ میں نے بڑے غور سے سنا اور کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ میری سماعت فلسطین کے لئے کی گئی کسی دعا کی منتظر تھی۔ مجھے عربی تو آتی نہیں ہے اس لئے مجھے کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن میں سوچ رہی تھی کہ اگر فلسطین یا بیت المقدس وغیرہ کے الفاظ بھی میری سماعت سے ٹکرا جائیں تو میں سمجھ جاوں گی کہ ان کے لئے دعا کی گئی ہے۔ بالآخر صرف ایک بار لفظ بیت المقدس سننے کا ملا تو مجھے کچھ تشفی ہوئی۔ اس وقت اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوا کہ مجھے عربی زبان بھی لازمی سیکھنی چاہیئے۔ اگرچہ قرآن پاک کا اردو ترجمہ تو ہم پڑھتے ہی ہیں لیکن عربی بھی ہمیں لازمی سیکھنی چاہیئے۔ خطبہ کے بعد دعا ہوئی اور پھر نماز جمعہ کی ادائیگی۔ آج ہم سب بہت خوش تھے ایک تو عمرہ کی ادائیگی اور بیت اللہ کے سامنے نماز جمعہ کی ادائیگی بہت لطف اندوز اور روح کو تازگی عطا کرنے والے لمحات تھے۔ حرم شریف میں گزرنے والا ہر ہر پل ہی بہت لطف اندوز اور ذہن اور روح کو جلا بخشنے والا ہوتا ہے۔ بھائی بھی نماز پڑھ کر واپس آ گئے تھے اس لئے اب حسب معمول بوتلوں میں آب زم زم بھر کر ہم نے ہوٹل کا رخ کیا۔ غیر معمولی ہجوم کے باعث آج تو آب زم زم لینا اور حرم شریف سے باہر نکلنا بہت صبر آزما ہو گیا تھا۔ آج تو کبوتر چوک پر بھی بہت رش تھا اور کھانا بھی روزانہ کے مقابلے میں بڑی مقدار میں تقسیم کیا جا رہا تھا یہاں کھانا تقسیم کرنے والے سبیل سبیل کی آوازیں لگا کر لوگوں کو جمع کر رہے تھے، جس کے لئے انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی کیونکہ کھانا دیکھ کر لوگ خود ہی بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اس بار تو ہم نے بھی لائن میں لگ کر کھانا لیا لیکن پہلے دیکھ لیا کہ کون سی لائن سب سے چھوٹی ہے کیونکہ ہم نے ابھی تک بال نہیں تراشے تھے اس حالت احرام کے باعث وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حرم شریف کے آس پاس بہت بڑی مقدار میں کھانا اور تبرکات تقسیم ہو رہے ہوتے ہیں، اگر کوئی وہاں کھانا نا بھی خریدے تب بھی تینوں وقت پیٹ بھر کر آرام سے کھانا کھا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے اور دیگر اشیا پر بری طرح جھپٹتے دکھائی دیئے حتیٰ کہ تقسیم کرنے والے پریشان ہو جاتے تھے۔ یہ تہذیب یافتہ لوگوں کی نشانی نہیں ہے۔ ہم ایسے ہجوم سے ہر ممکن دور رہتے تھے۔ بہر حال ہم جلدی جلدی کھانا

بس کے ذریعے مکہ سے مدینے کا سفر 6 گھنٹے کا

لے کر ہوٹل پہنچے اور بال تراش کر احرام کی پابندیوں سے فارغ ہوئے یوں ہمارا تیسرا عمرہ مکمل ہوا الحمدللہ! پھر تسلی سے کھانا کھایا۔ ہم نے جو کھانا سبیل سے لیا تھا وہ ابھی تک گرم تھا جس میں چکن مندی، جوس کے ڈبے اور پانی کی بوتلیں شامل تھیں۔ یہ کھانا ذائقے اور خوشبو میں بہت منفرد اور لذیذ تھا۔ امی کو تو بہت ہی پسند آیا تھا کیونکہ اس میں تیز مصالحوں کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ لہذا امی نے فورا فرمائش کر دی کہ انہیں تو یہ ہی چاول لا کر دے دیا کریں۔ سعودی

عرب کے کھانوں میں مصالحوں کا استعمال کم ہی کیا جاتا ہے یہاں تک کہ پاکستانی ہوٹلوں پر ملنے والے کھانے بھی بہت ہلکے مصالحے والے ہوتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے کی نشست تو لازمی بنتی ہے۔ وہاں ایک کپ چائے ۲ ریال کی ملتی ہے اور ہم کراچی والوں کے لئے تو چائے ایندھن کا کام کرتی ہے اب ایک کپ سے ہمارا گذارا ہو نہیں سکتا تھا اسی لئے چائے کا سامان اور الیکٹرک کیٹل ساتھ لے جانا لازمی ہوتا ہے۔ دوپہر میں کچھ ستانے کے بعد نماز عصر سے پہلے ہم دوبارہ حرم شریف کی جانب رواں دواں ہوئے۔ کعبہ شریف کے سامنے نماز پڑھنے کا جو لطف مجھے ملتا وہ کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ ہم قبلہ رخ ہو کر نماز کی نیت باندھتے ہیں لیکن جب قبلہ ہی نظروں کے سامنے ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اب یہ ہمارا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔ پہلے ہم نماز فجر کے لئے جاتے اور پھر عصر کے وقت جاتے اور عشاء پڑھ کر واپس آتے۔ اس دوران ہم نفلی طواف کرتے رہتے یا پھر وہاں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھتے۔ خاص طور پر نماز مغرب کا وقت مجھے بہت پرنور لگتا تھا۔ لاکھوں کا ہجوم لیکن جماعت کے وقت خاموشی طاری، صرف کعبہ کے گرد اڑتی ابابیل کی چہچہاہٹ سنائی دیتی تھی جو کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ نماز ظہر کی ادائیگی بھی کئی بار ہم نے حرم شریف میں کی۔ البتہ کبھی کبھی امی نہیں جاتی تھیں یا پھر جلدی واپس آ جاتی تھیں۔ پھر ہمیں بھی ان کے ساتھ جلدی واپس آنا پڑتا کیونکہ ان کی صحت کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ اگر آپ اپنے ضعیف یا بیمار والدین کے ساتھ عمرہ یا حج کی ادائیگی کے لئے جاتے ہیں تو ان کی صحت اور آرام کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہاں جا کر ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وقت حرم شریف میں گزارے اور ساری نمازیں وہیں پڑھے لیکن اگر والدین کی صحت اور آرام کے پیش نظر آپ ایسا نہیں کر پاتے ہیں تو یہ پریشانی نہیں بلکہ سعادت اور خوش نصیبی کی بات ہے کہ اللہ نے اس مقدس مقام پر والدین کی خدمت گزاری کا موقع دیا ہے۔ لیکن ہمارے معاملے میں تو یہ خوش نصیبی سب سے زیادہ بھائی نے اپنے حصے میں رکھی وہ ہی اکثر امی کے ساتھ ہوٹل میں رکتے تھے اور ہم دونوں بہنوں کو اکیلے حرم شریف بھیج دیا کرتے تھے۔ اللہ میرے والدین اور بہن بھائیوں کو ہمیشہ سلامت رکھیں۔ آمین ثمہ آمین

کبوتر چوک کے ساتھ ہی ایک بڑا سا خیمہ لگا ہوا ہے جہاں زائرین

میں مختلف چیزیں تقسیم کی جاتی ہیں یہ خیمہ سعودی حکومت کے زیر نگرانی ہے۔اور اس کے آس پاس پانی کی بڑی بڑی سبیلیں بھی لگائی گئی ہیں جہاں ہر وقت ٹھنڈا پانی تقسیم کیا جاتا ہے۔اس بار نماز عصر کے لئے حرم جاتے وقت ہم نے بھی خیمے کا رخ کیا تا کہ وہاں کے معاملات کا جائزہ بھی لیا جاسکے۔خیمے کے اندر جا کر تو میں حیران ہی رہ گئی۔وہاں بڑی مقدار میں چیزیں جمع تھیں جو مختلف وقتوں میں زائرین میں تقسیم کی جاتی تھیں۔لیکن اس وقت وہاں افطار کے پیکٹ تقسیم ہو رہے تھے یہ دیکھ کر تو میری خوشی کی انتہا نا رہی کیونکہ یہ بلکل وہ ہی پیکٹ تھے جو حرم شریف میں روزہ داروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔لیکن یہاں ہر آنے جانے والوں کو دیئے جا رہے تھے ۔ان پیکٹوں میں پانی کی بوتلیں، کیک، بن، کھجوریں، دہی اور جوس کی بوتلیں رکھی گئی تھیں۔یہاں میری یہ خواہش بھی پوری ہوئی کہ مجھے حرم شریف میں ملنے والی افطاری کھانی ہے۔اور جب عشاء کی بعد ہم واپس آرہے تھے تو یہاں ایک ایک کلو کے کھجور کے پیکٹ تقسیم کئے جا رہے تھے۔اگلے دن یہاں سے ہمیں قرآن پاک ملے اور امی کو انہوں نے ایک جائے نماز بھی دیا۔پھر تو ہم روزانہ آتے اور جاتے وقت یہاں کے تبرکات لازمی لیتے۔یہاں سے ہمیں کل ۸ قرآن پاک ملے جو پاکستان آکر ہم نے سب بہن بھائیوں میں تقسیم کئے۔یہ سب بھی اس سرزمین کی خوبصورت بہاریں ہیں ۔میں نے خیمے میں خدمت پر مامور ایک پاکستانی شخص سے اس خیمے کے متعلق تفصیلی معلومات جاننا چاہی لیکن اس نے کہا کہ اس کی تفصیلات تو ان کے کفیل کو ہی معلوم ہوں گی لیکن کفیل وہاں موجود نہیں تھا۔اور اس وقت جو شخص وہاں نگراں کے فرائض انجام دے رہا تھا اسے اردو سمجھ نہیں آرہی تھی اور مجھے عربی۔البتہ پاکستانی خادم نے صرف اتنا بتایا کہ اس خیمے کے لئے سارے فنڈز ترکی کی حکومت کی جانب سے ملتے ہیں اور اسے یہاں قائم ہوئے ابھی ایک ہی سال کا عرصہ گذرا ہے۔اور ایسا ہی تھا کیونکہ پچھلی بار ۲۰۲۳ میں جب ہم مکہ مکرمہ آئے تھے اس وقت یہ خیمہ یہاں نہیں تھا اور نا ہی اتنی بڑی مقدار میں پانی اور کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔البتہ مدینہ منورہ میں ترکوں کا ایک خیمہ ضرور تھا جہاں ظہر اور عشاء کے بعد کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔مکہ مکرمہ میں یہ خیمے ایک سال قبل ہی ترکی کی حکومت کی جانب سے قائم کئے گئے ہیں، ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ میں دو مقامات پر یہ خیمے لگے ہیں ایک تو کبوتر چوک پر اور دوسرا شاہراہ کبری پر۔اتنی باتیں کرنے کے بعد تو اب خیمے کا عملہ ہمیں پہچاننے لگ گیا تھا۔ہم وہاں باہر سے بھی گزر کر جاتے تو یہ لوگ ہمیں سلام کرتے اور خیریت معلوم کرتے تھے۔ہم لوگ حرم شریف سے ملنے والا ہر تبرک بڑے شوق سے لیتے اور کھاتے تھے کیونکہ اس در کا تبرک تو نصیب والوں کو نصیب ہوتا ہے۔الحمدللہ! میں بھی پاکستان سے بسکٹ کے بہت سارے ڈبے لے کر گئی تھی جو وہاں بچوں میں تقسیم کئے، بچے بڑے شوق سے بسکٹ لیتے اور شکرا کہتے۔اس کے علاوہ ہم پاکستان سے کبوتروں کے لئے باجرہ بھی لے کر گئے تھے جو ہم نے کبوتر چوک اور مسجد عائشہ کے کبوتروں کو کھلایا جبکہ کچھ مدینہ منورہ کے کبوتروں کے لئے بچا کر رکھ لیا۔یہاں کبوتر چوک پر خواتین دانا بیچ رہی ہوتی ہیں جس میں چنے، جو، اور مکئی وغیرہ شامل ہوتی ہے لیکن ہم پاکستان سے باجرہ لے کر گئے تھے۔

اب قارئین کو مکہ مکرمہ کی دیگر زیارات کا احوال بھی بتاتی چلوں۔جمعۃ المبارک کے دن عمرے کی ادائیگی کے ساتھ ہی ہمیں ٹریول گائیڈ کا پیغام مل گیا تھا کہ ہفتے کے دن صبح ۹ بجے ہمیں

طائف میں پہلی زیارت مسجد عبداللہ بن عباس کی کروائی گئی

طائف کی زیارات کے لئے جانا ہے۔ہم تو یہ پیغام سن کر بہت خوش ہوئے کیونکہ پچھلی بار ہم طائف کی زیارات کے لئے نہیں جا سکے تھے۔طائف کی زیارت پر جانے والوں کے لئے عمرہ لازم ہوجاتا ہے اور جو اس موقع پر عمرہ نا کرے اس پر دم واجب ہوجاتا ہے۔حج یا عمرہ میں بعض غلطیوں کی وجہ سے ایک بکرا یا دنبہ وغیرہ حرم کی حدود میں ذبح کرنا واجب ہوتا ہے، اسے "دم" کہتے ہیں۔دَم میں پوری

بکری، بھیڑ یا اونٹ، گائے وغیرہ کے ساتویں حصے کی قربانی شامل ہوتی ہے۔

لیکن یہاں بھی امی کی صحت کا خیال آیا اور ان سے پوچھا کہ وہ زیارت پر جائیں گی یا نہیں کیونکہ اگر گئی تو عمرہ لازم کرنا ہے اور ابھی ایک عمرہ کی ادائیگی کی تھی۔اگلے دن پھر طائف کا لمبا سفر اور عمرہ۔اور اگر امی نہیں جاتی تو ہم بہن بھائیوں میں سے ان کے پاس کوئی رک جاتا جس کے لئے بھائی پہلے ہی تیار تھے اس معاملے میں ہمیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ بھائی نے سارے ثواب پر قبضہ کیا ہوا ہے وہ ہمیں موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔لیکن امی کے جواب نے تو ہمیں حیران ہی کر دیا۔انہوں نے صاف کہا کہ میں تو زیارت پر لازمی جاوں گی اور عمرہ بھی لازمی کروں گی ورنہ میرا ایک عمرہ کم ہوجائے گا اور پتہ نہیں پھر اللہ کب موقع عطا فرمائیں اور ویسے بھی مجھے تو تم لوگ ویل چیئر پر عمرہ کرواگے۔ہمیں اور کیا چاہیئے تھا، اس وقت امی پر پیار بھی بہت آیا اور اس بات کا خیال بھی آیا کہ کہیں وہ ہماری وجہ سے تو ایسا نہیں کر رہی۔لیکن ان کی لگن دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی جانا چاہتی ہیں۔اللہ ہمارے والدین کو ہمیشہ سلامت رکھیں، آمین ثمہ آمین۔لہٰذا ہم نے صبح کی کچھ تیاری کر کے رات جلدی سونے کا ارادہ کیا۔صبح نماز فجر کے بعد ناشتہ کر کے کچھ ضروری سامان رکھا جس میں پانی، امی کی دوا اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں شامل تھیں۔کسی بھی زیارت یا سفر پر زیادہ سامان لے جانے سے ہم گریز کرتے تھے کیونکہ اس سے سفر مشکل ہوجاتا ہے۔گاڑی صبح ۱۰ بجے آئے اور زائرین کو جمع کرتے کرتے ۱۱ بج گئے۔مکہ مکرمہ سے طائف کا سفر تقریباً دو سے ڈھائی گھنٹے کا ہے۔

اہل طائف کو دین حق کی تعلیم دینے کے لیے آپ ﷺ نے بعثت کے دسویں سال حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے

ساتھ طائف کا سفر کیا۔ طائف مکہ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف ایک خوب صورت وادی ہے جو کہ بہت سرسبز و شاداب، زرخیز باغات اور پہاڑوں سے مزین ہے۔ اہل طائف تک جب دعوت توحید پہنچی تو اہل مکہ کی طرح وہ بھی اس نئے دین کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے بلکہ یہ لوگ تو آپ ﷺ کے ساتھ نازیبا سلوک کرنے میں قریش سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ طائف میں سب سے پہلی زیارت ہمیں مسجد عبداللہ بن عباس کی کروائی گئی۔ یہ مسجد طائف شہر کی ایک تاریخی مسجد ہے۔ اس مسجد کا نام ابن عباسؓ کے نام پر رکھا گیا ہے اور آپؓ اسی مسجد کے ساتھ قبرستان میں مدفون ہیں۔ ہمارے گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ یہ مسجد بھی اس جگہ پر بنائی گئی ہے جہاں پیغمبر اکرم محمد ﷺ نے نماز ادا کی تھی۔ بنو ثقیف کے محاصرے میں شہید ہونے والوں کے لیے قبرستان اسی سال مسجد کے مشرقی جانب بنایا گیا تھا۔ ابن عباس نبی کریم ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ اس مسجد کے ساتھ ایک مکتب بھی بنایا گیا ہے جو اس دن بند تھا۔ البتہ مسجد کے اندر ہم نے نوافل ادا کئے اور نماز ظہر کا وقت بھی ہو چکا تھا اس لئے نماز ظہر بھی ہم نے اسی مسجد میں ادا کی اور گاڑی میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔ (ساتھ ساتھ ٹریول گائیڈ ہمیں شہر طائف کے اہم واقعات بھی سنا رہے تھے۔ لیکن ان سے سنے ہر واقعے کی تصدیق ضروری تھی کیونکہ ان کی معلومات اتنی مستند نہیں ہوتی ہیں)۔

طائف کے اوباش لڑکوں نے نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مار مار کر زخمی کر دیا حتیٰ آپ کے نعلین مبارک لہو سے بھر گئے۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ اللہ کے حکم سے تشریف لائے اور عرض کی: مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے آپ ﷺ جو چاہیں حکم کریں میں تعمیل کروں گا آپ ﷺ حکم دیں مکہ کی دونوں طرف کے پہاڑوں کو ملا کر ان تمام بے ادب اور گستاخوں کو پیس ڈالوں؟ لیکن رحمت اللعالمین ﷺ نے جواب دیا کہ، اگر یہ بدنصیب ایمان نہیں لائے تو کیا ہوا میں ان کی آنے والی نسل سے ہرگز ناامید نہیں ہوں، مجھے اللہ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ ہے کہ وہ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اللہ کی توحید کے قائل اور شرک سے بیزار ہوں گے۔ سبحان اللہ

زخموں سے چور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک باغ میں پناہ گزین تھے تو عتبہ نے انگوروں کا ایک خوشہ اپنے غلام عداس سے بھجوایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر منہ میں رکھا۔ عداس نے حیرت سے کہا" یہ کلام تو یہاں کے باشندے نہیں بولتے"۔ حضور ﷺ نے عداس سے پوچھا کہ تم کہاں کے ہو اور کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو؟ اس نے عرض کیا" میں مسیحی ہوں اور نینوی کا رہنے والا ہوں"۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ پورا قصہ ہمارے ٹریول گائیڈ نے ہمیں سنایا اور ساتھ وہ باغ بھی دکھایا جہاں آپ ﷺ کو انگوروں کا خوشہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن یہ زیارت گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کروائی گئی۔ اس کے بعد مسجد علیؓ دکھائی گئی۔ طائف کی یہ مسجد علی بہت مشہور ہے جسے مسجد المدھون اور قنطارہ بھی کہتے ہیں، اسکے مینار کی وجہ سے یہ زیادہ مشہور ہے،

5 ریال میں دال اور چاول دونوں مل رہے تھے

کہتے ہیں کہ یہ پہلی مسجد ہے جسکا مینارہ بنایا گیا تھا اور اسے حضرت علیؓ نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ مسجد بہت ہی چھوٹی سی ہے اور چونے کے پتھر اور اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں اس مسجد میں نوافل ادا کروں لیکن یہاں بھی گاڑی نہیں روکی گئی۔ لیکن آگے جا کر مسجد الکوع پر گاڑی روکی گئی جسے مسجد رسول ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔ مسجد الکوع طائف میں جبل ابوزبیدہ کے پہاڑوں کے بیچ میں موجود ہے۔ جہاں پر مسجد الکوع تعمیر کی گئی ہے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر طائف کے دوران کچھ دیر قیام فرمایا تھا۔ اس مسجد کا مسجد الموقف کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے سفر کے دوران یہاں کچھ دیر رکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیک بھی لگائی۔ اسی جگہ پر مسجد الکوع بنائی گئی۔ یہ مسجد صدیاں گزرنے کے باوجود اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ اس کے دروازے کو لوہے کی جالیاں لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ زائرین باہر کھڑے ہو کر مسجد کی زیارت کر سکتے ہیں۔ اس مسجد کی زیارت کے بعد میرے ذہن میں وہ سارے واقعات گھومنے لگے جو میں نے آپ ﷺ کے سفر طائف سے متعلق پڑھے اور سنے تھے کہ کس طرح ہمارے پیارے نبی ﷺ کو تبلیغ اسلام کی پاداش میں مشکلات، مصائب، تکالیف، آزمائشوں، اذیتوں اور امتحانات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ساری تکالیف سہہ کر بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اور دین حق کا پرچم رہتی دنیا تک بلند کر دیا۔ یہاں طائف کی زیارات کا مختصر سلسلہ ختم ہوا اور ہمیں میقات کی جانب لے جایا گیا تا کہ ہم وہاں سے عمرہ کی نیت کر لیں۔ طائف سے آنے والوں کی میقات "قرن المنازل" ہے۔ اس کا موجودہ نام سیل الکبیر ہے۔ یہاں ہم نے نوافل ادا کئے اور عمرہ کی نیت کی۔ پھر ہمارا قافلہ مکہ مکرمہ کی جانب رواں دواں ہوا اور گاڑی نے ازان عصر کے بعد ہمیں ہوٹل تک پہنچایا۔ ہوٹل میں نماز عصر کی ادائیگی اور چائے پینے کے بعد ہم عمرہ کی ادائیگی کے لئے حرم شریف پہنچے تو یہاں امی کی جانب سے ایک سرپرائز ملا۔ وہ یہ کہ انہوں نے طواف کعبہ مطاف میں اپنے قدموں سے کرنے کا کہا۔ لہذا پہلے کی طرح ویل چیئر پہلی منزل پر محفوظ جگہ پر چھوڑ کر ہم نے طواف کعبہ شروع کیا، پھر چیئر لے کر سعی کی جانب بڑھے، ابھی سعی کے دو ہی چکر مکمل ہوئے تھے کہ ازان مغرب ہوگئی باقی چکر ہم نے نماز مغرب کے بعد مکمل کئے لیکن ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے وہی بیٹھ کر نماز عشاء کا انتظار کیا، کیونکہ اب عشاء میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔ لہذا نماز عشاء کے بعد ہم نے ہوٹل کا رخ کیا۔ اور یوں ہمارا چوتھا عمرہ بھی بخیر و عافیت مکمل ہوا۔ الحمداللہ!

آج رات بھی ہمیں جلدی سونا اور صبح جلدی جاگنا تھا کیونکہ اگلی صبح ۱۳ اپریل کو ہماری مدینہ منورہ کی روانگی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر دل بہت مسرور تھا کہ ہم صبح سوئے مدینہ جا رہے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے در پر حاضری کا شرف حاصل کریں گے۔ اور ریاض الجنۃ میں حاضری اور وہاں نوافل پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوگا۔ ریاض الجنۃ میں نوافل پڑھنے کا پرمٹ بھائی کو تو پاکستان سے ہی مل گیا تھا البتہ خواتین کے لئے مختص اوقات میں پرمٹ مشکل سے ملتا ہے۔ لیکن الحمداللہ ہمیں بھی مکہ مکرمہ پہنچنے کے اگلے ہی دن پرمٹ مل گیا تھا۔ مدینہ منورہ کی حاضری کے لئے چونکہ ہمارے گروپ میں شامل تمام ۱۳ افراد کو ایک ساتھ جانا تھا اس لئے بسمہ کمپنی کے ٹرانسپورٹر سے رابطہ کر کے ہم نے انہیں اپنی مدینہ روانگی سے متعلق آگاہ کیا۔ ٹرانسپورٹر سے رابطہ کر کے روانگی کا وقت طے کرنا اور گروپ کے تمام لوگوں کو آگاہ کرنا دراصل ٹریول ایجنٹ کی ذمہ داری ہوتا ہے لیکن ہمارا ٹریول ایجنٹ تو ہمارے ہوٹل تبدیل کروانے کے بعد ہمیں نظر ہی نہیں آیا، اس کے اس رویے سے لگ رہا تھا کہ جیسے قصور اس کا نہیں بلکہ ہمارا ہی ہے۔ بہر حال ہمارے ساتھ تو اللہ کی مدد تھی۔ ٹرانسپورٹر کی جانب سے ہمیں صبح ۶ بجے کا وقت دیا گیا۔ اس لئے جلدی جلدی سارا سامان پیک کر کے ہم سو گئے سوائے چائے کے سامان کے تا کہ صبح تاخیر نا ہو جائے۔ لیکن گاڑی صبح ۶ بجے کے بجائے ۱۰ بجے آئی۔ اور ہم سارا سامان سمیٹے ہوٹل کے استقبالیہ پر گاڑی کا انتظار کرتے رہے۔ جب بھی ٹرانسپورٹر کو فون کر کے گاڑی کے بارے میں پوچھتے وہاں سے ایک ہی جواب ملتا کہ گاڑی ۵ منٹ میں آ رہی ہے، ہر آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں یہ ہی جواب مل رہا تھا۔ بالا آخر ۱۰ بجے گاڑی آئی اور

پھر عمرے کی سعادت حاصل

مسافروں کو جمع کرتے ہوئے ۱۱ بجے مدینہ منورہ کی جانب روانگی عمل میں آئی۔ ہم درود وسلام کے نذرانے پیش کرتے در نبی ﷺ کی جانب رواں دواں ہوئے۔

بس کے ذریعے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر تقریباً ۶ گھنٹے کا ہے۔ تقریباً ۳ گھنٹے کی مسافت کے بعد بس ایک پاکستانی ہوٹل پر رکی تاکہ مسافر کھانا وغیرہ کھا لیں۔ ہم نے چونکہ کھانے پینے کی چیزیں اپنے ساتھ رکھی تھیں اور مکہ مکرمہ کے ہوٹل سے آلو کے پراٹھے بھی لے لئے تھے اور ساتھ ہی ایک دکان سے کیلے بھی لے لئے تھے۔ آلو کا پراٹھا ۳ ریال میں ایک ملا تھا اور سائز میں بڑا تھا لہٰذا ہم ۴ لوگوں کے لئے ۲ پراٹھے کافی تھے ویسے بھی دوران سفر کم ہی کھانا چاہیئے۔ کیلے وہاں درجن نہیں بلکہ کلو کے حساب سے ملتے ہیں۔ جو کہ ۸ ریال کے ایک کلو تھے۔ اس لئے اب ہمیں مزید یہاں سے کچھ لینے کی ضرورت تو پیش نہیں آئی البتہ ہوٹل کے ساتھ ہی موجود مسجد میں ہم نے نماز ظہر کی ادائیگی کی۔ یہاں تقریباً 45 منٹ گاڑی رکی پھر دوبارہ سفر شروع ہوگیا تھا۔ اور آخر کار ہم مدینہ کی گلیوں میں پہنچ گئے۔ یہاں دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی اور لبوں پر درود وسلام کا ورد جاری رہا۔ ہماری گاڑی مسجد نبوی ﷺ کے قریب پہنچ چکی تھی، جہاں سب سے پہلے ہمیں مسجد بلال رضی اللہ عنہ نظر آئی۔ اور پھر آگے جا کر گنبد خضری کی جھلک دیکھ کر آنکھوں کو کچھ ٹھنڈک نصیب ہوئی لیکن دل ابھی بے چین تھا کہ جلدی ہم اپنے ہوٹل پہنچیں اور وہاں سامان رکھ کر روضہ رسول ﷺ پر حاضری لگوائیں۔ ہماری گاڑی روضہ رسول ﷺ کے سامنے سے گزر گئی لیکن ہمارے ہوٹل کا ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں بھی ٹریول ایجنٹ نے ایک بلڈنگ میں کمرے بک کروا کر واچر پر فرضی نام لکھوا رکھا تھا۔ لہٰذا ڈرائیور کی بات ٹریول ایجنٹ سے کروائی گئی جس کی ہدایت پر ہمیں شاہراہ العوالی پر اتارا گیا جہاں سے ٹریول ایجنٹ کا بیٹا ہمیں گلیوں سے گزارتا ہوا بلڈنگ تک لے گیا۔ یہ بلڈنگ جنت البقیع قبرستان کے عقب والے روڈ پر تھی لیکن مکہ والی بلڈنگ سے کچھ بہتر تھی۔ لیکن اس کا فاصلہ روضہ رسول ﷺ سے تقریباً ۱۱۰۰ سے ۱۲۰۰ میٹر تھا جو کہ ہمیں پہلے ۵۰۰ میٹر ہی بتایا گیا تھا۔ بہر حال اس بار بھائی نے فی الحال تحمل کا مظاہرہ کرنے کو کہا جو کہ ہم نے پہلے بھی کیا تھا، امی اپنی طبیعت کی وجہ سے کافی پریشان ہوگئی تھیں، بھائی نے انہیں بھی تسلی دی کہ مسئلہ کا کوئی نا کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ اس بار چونکہ ہم شہر مصطفی ﷺ میں تھے اور آپ ﷺ کی تعلیم تو درگزر اور صبر سے کام لینے کی ہے اسی لئے خاموشی اختیار کی اور اس بات پر اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں اس مقدس سرزمین پر قدم رکھنا نصیب فرمائیں ہیں۔ گروپ کے دیگر افراد ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں بھی بلڈنگ کی اکلوتی اور چھوٹی سی لفٹ میں باری باری سامان کمرے تک پہنچایا اور بغیر کسی شکایت کے کمرے میں سامان رکھ کر ہم نے نماز عصر ادا کی اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کی تیاری کی۔ وہاں کی گلیوں میں ویل چیئر نہیں چل سکتی تھی اس لئے امی روڈ تک تو پیدل ہی گئی پھر ہموار راستہ ملتے پر انہیں ہم نے چیئر پر بٹھا لیا اور لوگوں سے راستہ پوچھتے ہوئے روضہ رسول ﷺ تک جا پہنچے۔ ہم جنت البقیع کی جانب سے گیٹ نمبر ۳۶۵ سے مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوئے۔ گنبد خضری پر نظر پڑتے ہی جو کیفیت طاری ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ ادب، تقدس، احترام اور حب نبی ﷺ سے سرشار، ہم عاصی نظریں جھکائے اس در پر حاضر تھے۔ درود وسلام کے نذرانے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ یہ التجا بھی کر رہے تھے کہ رحمت اللعالمین ہم پر بھی رحمت کی نظر فرما دیں، ہماری لاج رکھ لیں اور ہماری اس حاضری کو قبول فرما لیں۔ روضہ رسول ﷺ پر حاضر ہونا اور سلام پیش کرنا ہر امتی پر رسول اللہ ﷺ کا حق ہے اور امتی کے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ الحمدللہ۔ نماز عشاء ہم نے مسجد نبوی ﷺ ہی میں ادا کی۔ اس کے بعد بھائی تو روضہ مبارک ﷺ پر حاضری کے لئے مسجد کے اندر چلے گئے چونکہ خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے ہم وہیں گنبد خضری کے سامنے بیٹھ گئے، شکرانے کے نوافل ادا کئے اور اپنے آقا کریم ﷺ سے بہت ساری باتیں کیں۔ بھائی واپس آگئے تھے لیکن میرا وہاں سے اٹھنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر امی کی طبیعت کا خیال کرتے ہوئے اٹھنا پڑا۔ کیونکہ پورے دن کا سفر کیا تھا اور شام کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اسی لئے ہوٹل یعنی بلڈنگ کا رخ کرنا پڑا۔ لیکن اس سے پہلے آب زم زم بھی لینا ضروری تھا جس کے لئے ہم نے خالی بوتلیں ساتھ رکھ لی تھیں۔ مسجد الحرام کی طرح مسجد نبوی ﷺ سے ہر وقت آب زم زم نہیں بھرا جا سکتا ہے، یہاں ایک پلانٹ بنایا گیا ہے جہاں سے زائرین صرف مخصوص اوقات میں زم زم بھر سکتے ہیں۔ رات کا وقت ۱۰ بجے سے ۰۲ بجے تک کا تھا، صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے جبکہ دوپہر ۵ بجے سے ۶ بجے کے اوقات مقرر تھے۔ ہم رات دس بجے تک ہم وہیں تھے لیکن پلانٹ پر پہنچ کر پتا چلا کہ وہاں سے صرف بڑے گیلن بھرنے کی اجازت ہے جبکہ ہمارے پاس تو بوتلیں تھیں لیکن ہماری درخواست پر ہمیں بوتلوں ہی میں زم زم لینے کی اجازت مل گئی لیکن ساتھ ہی اگلی بار گیلن لانے کی تنبیہ بھی کی گئی۔ جس پر ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ہوٹل کا رخ کیا۔ یہ راستہ بہت طویل تھا اور بھائی بھی ویل چیئر چلا کر تھک رہے تھے، ہمیں وہ چلانے نہیں دے رہے تھے اور ہمیں اب امی کے ساتھ ساتھ بھائی کی طبیعت کا خیال بھی ستا رہا تھا کیونکہ بھائی کی کمر کا بھی ایک چھوٹا سا آپریشن ہو چکا ہے۔

بہر حال یہ سفر بھی طے ہوا۔ بلڈنگ کے آس پاس پاکستانی کھانوں کے کئی ہوٹل تھے ان کے نام بھی پاکستان کے شہروں پر ہی رکھے گئے تھے، ہم ایک دو ہوٹلوں پر رکے تاکہ کھانے کے لئے کچھ لے لیا جائے لیکن اس وقت سب پر کھانا ختم ہو چکا تھا۔ یہ تو بس کراچی ہی میں ہوتا ہے کہ اگر آپ رات کے تین یا چار بجے بھی باہر نکلیں تو کھانے پینے کے لئے سب دستیاب ہوتا ہے۔ آخر میں بلڈنگ کے نیچے ہی بنے ہوٹل میں ہمیں دال چاول مل گئے۔ لیکن جب ہوٹل والے نے قیمت ۵ ریال بتائی تو ہم نے حیران ہو کر پہلے دال چاول دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ کیونکہ مکہ مکرمہ میں ۸ ریال کا ایک سالن ۳ روٹیوں کے ساتھ ملتا تھا۔ یہاں ۵ ریال میں دال اور چاول دونوں مل رہے تھے۔ لیکن چاول دیکھنے کے بعد تو ہمیں ۵ ریال بھی زیادہ لگ رہے تھے۔ نا چاہتے ہوئے بھی ایک پلیٹ لینا پڑی تاکہ امی تو کچھ کھا لیں۔ لیکن جب کھانے بیٹھے تو امی بھی دو تین چمچ سے زیادہ نہیں کھا سکی۔ پھر ہم نے چائے اور ربسکٹ سے بھوک مٹائی اور مکہ مکرمہ سے تبرک میں ملنے والے بن اور کیک بھی کھائے۔ بھوک مٹانے کے لئے اتنا کافی تھا اور چائے نے تو ویسے ہی تھکن کا احساس کم کر دیا تھا۔ ہم چار، پانچ دن کا کھانا پاکستان سے لائے تھے وہ مکہ مکرمہ میں ہی ختم ہوگیا تھا اب ہمیں کھانا خرید کر کھانا تھا جس کا بجٹ ہم نے علیحدہ رکھا ہوا تھا۔

(جاری ہے)

"فرید ذکریا۔ بھارتی نژاد امریکی مصنف، ایڈیٹر اور دانشور ہیں، ان کی تصانیف تحقیق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کی کتاب post american world کی یہ تیرھویں قسط ہے۔ سنجیدہ قارئین نے اس سلسلے کو پسند کیا ہے۔ جس سے امریکہ پاکستان، امریکہ بھارت اور امریکہ چین کے تعلقات کا پسِ منظر بھی فکری اور تاریخی طور پر سامنے آتا ہے۔ اور مستقبل کی دھندلی سی تصویر بھی"

ہندومت کوئی مرکزی عقیدہ، نہ حلال نہ حرام

مصنف: فرید ذکریا　　تلخیص وترجمہ: سید عرفان علی یوسف

قسط نمبر 13

ہندوستانی ثقافت کا عالمی نظریہ:

ہندوستانی ثقافت، خاص طور پر ہندومت کی دنیا کو دیکھنے کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ ہندو، کنفیوشس عقیدے والوں کی طرح، خدا کے ایک وحدانی تصور پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ لاکھوں دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ ہر فرقہ، ہر ذیلی فرقہ، ہر خاندان اپنے الگ عقائد رکھتا ہے۔ کوئی کچھ عقائد مان سکتا ہے، کچھ رد کر سکتا ہے، یا کسی پر بھی یقین نہ رکھے، پھر بھی ہندو کہلا سکتا ہے۔ گوشت کھانے یا نہ کھانے، عبادت کرنے یا نہ کرنے، کسی بھی چیز سے ہندو ہونے کی شناخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ کوئی ارتداد ہے، نہ کفر، کیونکہ نہ کوئی مرکزی عقیدہ ہے، نہ کوئی اصول یا شریعت۔ نہ کچھ حلال ہے، نہ کچھ حرام۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر سر مونیر مونیر ولیمز (1899–1860)، جو بمبئی میں پیدا ہوئے تھے، ہندومت کا ہمہ گیر مطالعہ کرنے والے پہلے مغربی محقق تھے۔ انہوں نے 1877ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب Hinduism میں لکھا:

"] ہندومت سب کو قبول کرنے والا مذہب ہے... یہ روحانی بھی ہے اور مادی بھی، خفیہ بھی ہے اور ظاہری بھی، عقلی بھی ہے اور غیر عقلی بھی، پاکیزہ بھی ہے اور ناپاک بھی۔ یہ کثیر الاضلاع شے کی مانند ہے... کسی کے لیے عملی، کسی کے لیے اخلاقی، کسی کے لیے تخیلاتی، کسی کے لیے حسی اور کسی کے لیے فلسفیانہ۔ اگر کوئی صرف عبادات پر اکتفا کرے تو بھی کافی ہے، اگر کوئی صرف ایمان پر یقین رکھے تو بھی، اگر کوئی دنیاوی لذتیں چاہے تو بھی، اور اگر کوئی خدا اور انسان، روح و مادہ، اور تخلیق کے رازوں پر غور کرنا چاہے تو بھی۔ یہی وسعت اسے بے شمار ذیلی فرقوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔"

ہندومت کی جذب کرنے کی سب سے حیرت انگیز مثال بودھ مت کا اس میں مدغم ہو جانا ہے۔ بودھ مت ہندوستان میں پیدا ہوا، مگر آج اس کے ماننے والے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ ظلم و جبر نہیں، بلکہ ہندومت کی جذب کی قوت ہے، جس نے بودھ مت کے پیغام کو اس حد تک اپنا لیا کہ اس کی الگ شناخت باقی نہ رہی۔ اب اگر آپ بودھ مت کے پیروکاروں کو تلاش کرنا چاہیں، تو آپ کو کوریا، انڈونیشیا، یا جاپان جانا ہوگا۔ بنگالی ادیب نیرد چودھری ہندومت کی پیچیدگی سے عاجز آ گئے۔ انہوں نے لکھا:

"جتنا زیادہ کوئی اس مذہب کی تفصیلات کا مطالعہ کرے، اتنا ہی الجھن میں مبتلا ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی عقلی خلاصہ ممکن نہیں، بلکہ کوئی جذباتی تاثر بھی واضح طور پر بنانا مشکل ہے۔"

ہندومت، ابراہیمی مذاہب کی طرح کوئی منظم مذہب نہیں بلکہ ایک آزاد فکری فلسفہ ہے جو سوالات اٹھاتا ہے، جوابات نہیں دیتا۔ اگر اس کی مقدس ترین کتاب رگ وید کی کوئی مرکزی آیت ہو، تو وہ نغمۂ تخلیق (Creation Hymn) ہے:

"کون جانتا ہے؟ اور کون یقین سے کہہ سکتا ہے۔۔۔ تخلیق کب ہوئی، اور کیسے ہوئی؟ یہاں تک کہ دیوتا بھی تخلیق کے بعد آئے، تو اصل حقیقت کون جانتا ہے؟ اُس نے کیا؟ یا نہیں کیا؟ صرف وہی اوپر والا جانتا ہے، یا شاید وہ بھی نہیں!" اس بات کا کتاب پیدائش (Genesis) کی یقینی باتوں سے موازنہ کریں تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔

عملی اثرات: خارجہ پالیسی اور ہندو ذہنیت:

تو ان سب باتوں کا دنیا پر کیا اثر ہے؟ ہندو نہایت عملی ہوتے ہیں، اور خارجی حقیقتوں کے ساتھ باآسانی ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی تاجر عموماً ہندو ہی ہوتے ہیں، دنیا کے ہر اس ماحول میں پھلتے پھولتے ہیں جہاں تجارت اور کاروبار کی گنجائش ہو۔ چاہے امریکہ ہو، افریقہ یا مشرقِ بعید، ہندوستانی تاجر ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں، بس ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر کے کسی گوشے میں کسی دیوی دیوتا کی چھوٹی سی مورتی رکھ سکیں۔

بودھ مت کی طرح، ہندومت نہ صرف اختلافات کو برداشت کرتا ہے بلکہ انہیں جذب بھی کرتا ہے۔

اسلام بھی ہندوستان میں ہندومت کے اثر سے تبدیل ہوا، کم ابراہیمی، زیادہ روحانی بن گیا۔ ہندوستانی مسلمان اولیاء کرام، مزاروں، موسیقی، اور فن کی عزت کرتے ہیں، اور عام طور پر ایک عملی زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ اگرچہ اسلامی بنیاد پرستی کے عروج نے ہندوستانی اسلام کو بھی پیچھے دھکیلا ہے، پھر بھی ایک بڑی معاشرتی طاقت اسے مرکزی دھارے میں رکھے ہوئے ہے۔ یہی شاید اس حیرت انگیز اعداد و شمار کی وضاحت ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں 150 ملین مسلمان ہیں، اور انہوں نے طالبان و القاعدہ کا ابھار قریب ہی دیکھا مگر ان میں سے کوئی بھی القاعدہ سے وابستہ نہیں پایا گیا۔

خارجہ پالیسی: ابہام سے ہم آہنگی:

ہندوستانی، مغرب والوں کے مقابلے میں، خاص طور پر اینگلو۔امریکیوں سے زیادہ ابہام اور غیر یقینی صورتحال سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ وہ خارجہ پالیسی کو کسی مشنری جذبے یا جمہوریت کے پرچار کے طور پر نہیں دیکھتے۔ ہندو ذہنیت "جیو اور جینے دو" کی حامی ہے۔ اسی لیے ہندوستان، ملک کی خارجہ پالیسی کی واضح اور پابند تعبیرات سے گریزاں رہے گا۔ وہ خود کو امریکہ کا "اہم اتحادی" یا "خصوصی تعلق" رکھنے والا ملک کہلانے میں جھجک محسوس کرے گا۔ یہ ابہام دراصل ایشیائی معاشروں کی عمومی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ نیٹو جیسے اتحاد، جو سوویت توسیع پسندی کے خلاف قائم ہوئے، مغربی ممالک کے لیے تو موزوں تھے لیکن ایشیا میں ایسی واضح صف بندی قبول نہیں کی جاتی۔ یہاں سب چین کے خلاف اندیشوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن کوئی اسے کھل کر تسلیم نہیں کرے گا۔ یہ وہ طاقت کی سیاست ہے جو اپنا نام تک نہیں لیتی۔

جیسا کہ چین میں ہوا، ویسے ہی بھارت میں بھی ثقافتی شناخت کو حالیہ تاریخ کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ درحقیقت، بھارت نے برطانوی سامراج کا حصہ بن کر ایک منفرد مغربی تجربہ حاصل کیا۔ انگریزی زبان سیکھی، برطانوی سیاسی اور قانونی ادارے اپنائے، اور سامراجی پالیسیوں پر عملدرآمد کیا۔ آج لبرل خیالات بھارتی سوچ میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ وہ اب بہت سے پہلوؤں میں مقامی حیثیت اختیار کر

چکے ہیں۔ نہرو کی عالمی نظریاتی سوچ اور خارجہ پالیسی زیادہ تر مغربی، لبرل، اور سوشلسٹ اثرات کا نتیجہ تھی۔ آج مغرب میں انسانی حقوق اور جمہوریت پر جو بحث جاری ہے، وہی مباحثے دہلی، ممبئی، اور چنئی میں بھی بڑی آسانی سے اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ بھارتی اخبارات اور این جی اوز وہی خدشات اور تنقیدیں اٹھاتے ہیں جو لندن، پیرس یا واشنگٹن میں کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ رویے زیادہ تر بھارت کی انگریزی بولنے والی اشرافیہ تک محدود ہیں۔ یہ اب بھی اقلیت میں ہیں، اور بعض پہلوؤں میں مغربی دنیا میں اپنے وطن سے زیادہ آرام دہ محسوس کرتے ہیں۔ (کسی تعلیم یافتہ بھارتی تاجر، محقق، سائنسدان یا افسر سے پوچھیں کہ اُس نے آخری کتاب انگریزی کے علاوہ کس زبان میں پڑھی؟)

ہندوستان کی تاریخ، مذہب، ثقافت، امریکی نظریہ مکمل طور پر اپنانے سے روکتی ہے

مہاتما گاندھی ایک واضح طور پر "بھارتی" شخصیت تھے۔ ان کے خارجہ پالیسی کے خیالات ہندو عدم تشدد، مغربی انقلابی سوچ اور ایک حقیقت پسندانہ عملیت پسندی کا امتزاج تھے، جس کی تشکیل ممکنہ طور پر ان کے تاجر طبقے سے تعلق نے کی تھی۔ جب نہرو نے خود کو "بھارت پر حکمرانی کرنے والا آخری انگریز" کہا، تو وہ اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ جیسے جیسے ملک ترقی کرے گا، اس کی ثقافتی جڑیں واضح ہونے لگیں گی، اور ملک کی باگ ڈور مزید "خالص" بھارتیوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ مغربی اور بھارتی اثرات کی یہ باہمی کشمکش آج ایک تیزی سے بدلتی دنیا میں جاری ہے، جہاں معیشت اور سیاست بعض اوقات متضاد سمتوں میں چل رہے ہیں۔

ایٹمی طاقت:

امریکہ اور بھارت کے درمیان تجویز کردہ جوہری معاہدہ گلوبلائزیشن کے اقتصادی تناظر اور طاقت کی سیاست کے درمیان تناؤ کی ایک دلچسپ مثال پیش کرتا ہے۔ 2007 میں، واشنگٹن نے بھارت کے ساتھ تعلقات کو ایک بلند سطح پر لے جاتے ہوئے ایک جوہری معاہدے پر مذاکرات کا آغاز کیا۔ یہ شاید پالیسی ماہرین کے لیے ایک عام موضوع لگے، مگر حقیقت میں یہ معاہدہ بہت اہم ہے۔ اگر یہ کامیاب ہوجاتا ہے تو یہ عالمی تزویراتی نقشہ بدل دے گا۔ بھارت کو ایک اہم عالمی طاقت کے طور پر عالمی منظرنامے پر مستقل اور غیر مشروط طور پر لا کھڑا کرے گا، اس کی خفیہ ایٹمی حیثیت کو عمومیت عطا کرے گا، اور امریکہ کے ساتھ اس کی شراکت داری کو مضبوط کرے گا۔ یہ بھارت کو امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین جیسے جوہری ممالک کے برابر کھڑا کرتا ہے۔

بھارت نے برطانوی سامراج کا حصہ بن کر ایک منفرد مغربی تجربہ حاصل کیا

جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے (NPT) کے مطابق، وہ ممالک جن کے پاس 1968 میں جوہری ہتھیار موجود تھے، قانونی جوہری ریاستیں شمار ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو بھی ملک ایٹمی ہتھیار بنائے، وہ غیر قانونی تصور ہوتا ہے۔ (یہ سب سے بڑی "دادا گیری" کی شق تھی۔) بھارت نے 1974 میں ایک ایٹمی تجربہ کیا، اور وہ واحد ممکنہ عالمی طاقت ہے جو NPT نظام سے باہر ہے۔ بش انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ بھارت کو اس نظام میں شامل کرنا اس کی بقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی طرح کی وجوہات کی بنا پر بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (IAEA) کے سربراہ محمد البرادعی بھی پاک امریکہ جوہری معاہدے کے پُرجوش حامی تھے۔ عدم پھیلاؤ کا نظام ہمیشہ نظریاتی اصولوں کو حقیقت پسندی کے ساتھ متوازن کرتا آیا ہے۔ امریکہ خود دنیا بھر میں جوہری ہتھیاروں کی مخالفت کرتا ہے، مگر اپنے ہزاروں جوہری ہتھیار رکھے ہوئے ہے۔

بھارت کے لیے یہ معاہدہ ایک سادہ سوال ہے: کیا بھارت چین کی طرح ہے یا شمالی کوریا کی طرح ہے؟

نئی دہلی کا مؤقف ہے کہ دنیا بھارت کو ایک ایٹمی طاقت کے طور پر قبول کرے، اور بھارت اس کے بدلے اپنے پروگرام کو محفوظ اور شفاف بنانے کے لیے تیار ہے۔ امریکہ کی سابقہ پالیسی، بش انتظامیہ سے پہلے یہ تھی کہ بھارت کے جوہری پروگرام کو ختم کیا جائے، مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ بھارت نے 33 برس تک امریکی پابندیوں کا سامنا کیا، تب بھی اپنی پالیسی نہ بدلی، جب کہ وہ اس وقت اقتصادی طور پر بہت کمزور تھا۔ بھارت کو جاننے والا کوئی بھی شخص جانتا ہے کہ وہ جوہری ہتھیار چھوڑنے سے پہلے مزید کئی دہائیاں پابندیاں جھیلنے کو تیار ہے۔

معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ معاہدہ بھارت کے لیے اتنا ضروری نہیں۔ اس سے بھارت کو سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی تک زیادہ رسائی مل سکتی ہے، جو توانائی کی ضروریات کے لیے اہم ہے، مگر یہ بھارت کی مجموعی ترقی میں ایک چھوٹا سا پہلو ہے۔ عالمی معیشت کے تناظر میں دیکھا جائے تو بھارت کے لیے زیادہ موزوں یہی ہے کہ وہ اس معاملے پر وقت ضائع نہ کرے اور ترقی پر توجہ دے، اور یہ مسئلہ مؤخر کر دے۔ توانائی کے کئی متبادل ذرائع موجود ہیں، اور جرمنی اور جاپان نے بغیر جوہری ہتھیاروں کے عالمی طاقت کا مقام حاصل کیا۔

بھارت کی جوہری خواہشات کا تعلق قومی وقار اور جغرافیائی حکمت عملی سے ہے۔ بہت سے بھارتی سیاستدان اور سفارتکار اس بات پر نالاں ہیں کہ بھارت کو ہمیشہ چین، روس اور دیگر بڑی جوہری طاقتوں کے مقابلے میں دوسرے درجے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ ان تمام ممالک میں کوئی بھی ری ایکٹر کسی عالمی نگرانی کے تحت نہیں، جب کہ بھارت رضاکارانہ طور پر اپنے دو تہائی نیوکلیئر پروگرام کو IAEA کی نگرانی میں دینے پر تیار ہے۔ چین کے ساتھ اس معاملے میں خصوصی بے انصافی نئی دہلی کو چبھتی ہے۔ بھارتی حکام خاموشی سے یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ چین نے طویل عرصے تک خاص طور پر پاکستان کے ذریعے جوہری پھیلاؤ میں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ نے بیجنگ کے ساتھ سول جوہری ٹیکنالوجی کا تبادلہ کیا۔ بھارت، ان کے مطابق، ایک جمہوری، شفاف ملک ہے، جس کا عدم پھیلاؤ کا ریکارڈ بے داغ ہے، مگر اسے 33 برس تک اس تعاون سے محروم رکھا گیا۔

اس مسئلے پر، گلوبلائزیشن اور جیوپولیٹکس مختلف سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ امریکہ میں جوہری تخفیف کے حامی جنہیں بھارتی "عدم پھیلاؤ کے آیت اللہ" کہتے ہیں اس معاہدے کے مخالف ہیں، یا اس کی حمایت صرف اسی صورت میں کرتے ہیں جب بھارت اپنے "فزائل میٹیریل" کی پیداوار پر پابندی عائد کرے۔ مگر نئی دہلی کہتا ہے، نقشہ دیکھیں: بھارت کی سرحدیں چین اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ دونوں جوہری ہتھیاروں سے لیس ہیں، اور دونوں نے ایسی کسی پابندی پر اتفاق نہیں کیا۔ (چین نے بظاہر پلوٹونیم کی پیداوار روک دی ہے، جیسا کہ دیگر بڑی طاقتوں نے بھی، مگر یہ رضاکارانہ فیصلہ ہے کیونکہ ان کے پاس پہلے ہی اس مواد کی بڑی مقدار موجود ہے۔) بھارت اس لازمی پابندی کو یکطرفہ منجمدی پالیسی سمجھتا ہے۔

یہی اسٹریٹجک حقیقت امریکہ کے حساب کتاب میں بھی شامل ہے۔ امریکہ طویل عرصے سے اس کے خلاف ہے کہ کوئی ایک طاقت یورپ یا ایشیا میں غلبہ حاصل کرے۔ اگر بھارت کو اپنی ایٹمی طاقت محدود کرنے پر مجبور کیا جائے، بغیر اس کے کہ چین پر بھی ایسی پابندیاں عائد ہوں، تو نتیجہ چین کے حق میں طاقت کا ایک وسیع اور بڑھتا ہوا عدم توازن ہوگا۔ بھارت میں تعینات امریکہ کے ایک سابق سفیر، رابرٹ بلیک وِل نے سوال اٹھایا: "کیا یہ امریکہ کے طویل المدتی قومی مفاد میں ہے؟"

(جاری ہے)۔

”اردو اخبارات نے بہت پہلے تو ایڈیٹر کے نام خطوط بند کر دیئے تھے۔ اب تو ایڈیٹوریل کے خاتمے کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ ماہنامہ اطراف اس ماہ ''اخباری اداریہ نمبر'' شائع کر رہا ہے۔ کئی ماہ پہلے سے ہم نے انگریزی اخبارات میں شامل کیے جانے والے خطوط کے موضوعات پر تحقیق کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام قارئین کے نزدیک کن موضوعات کی اہمیت ہے۔“

ہر قسم کے جرگوں پر پابندی عاید کی جائے

تحریر: ذکیہ عباسی، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

BUSINESS RECORDER

DAWN

Letter to the editor

THE EXPRESS TRIBUNE

اس مضمون میں انگریزی اخبار 'ڈان' اور 'دی نیوز' میں اگست 2025 کے مہینے میں شایع ہونے والے خطوط کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

جرگوں پر پابندی

کراچی سے کے ٹی ایچ نے روایتی جرگے کے نظام کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں متعدد عدالتوں کی موجودگی میں پاکستان کی حکومت نے جرگوں کو ان کی مرضی کے مطابق چلنے اور قتل کا حکم دینے کی اجازت کیوں دے رکھی ہے؟ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ جرگے ٹارگٹ کلنگ میں ملوث دہشت گردوں کو مارنے کا حکم نہیں دیتے بلکہ ان میں صرف عام مقامی لوگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ حکومت ہر قسم کے جرگوں پر مکمل پابندی عائد کرے اور جرگوں کے حامیوں کے کسی بھی ناخوشگوار ردعمل کو روکنے کے لیے قانونی سہارا بھی دے۔

ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ (Remote Sensing Satellite)

عزیز احمد زئی اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ چین کی مدد سے پاکستان کا ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ کا حالیہ لانچ بروقت اور خوش آئند بات ہے۔ یہ پیشرفت قبل از وقت انتباہی نظام کا کام دینے اور آفات سے محفوظ رہنے میں مدد دے سکتی ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ آفات سے بچنے کے لیے صرف ڈیٹا اور ٹیکنالوجی ہی کافی نہیں ہے۔ آب و ہوا سے متعلق پالیسی سازی اور زمینی سطح پر کارروائی کے درمیان بڑھتا ہوا فرق ایک سنگین تشویش ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر توجہ طویل المدتی خطرے میں کمی کے بجائے آفات کے بعد امداد تک محدود رہتی ہے۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ ماحولیاتی لچک کو منصوبہ بندی کے تمام درجوں میں مرکزی حیثیت دی جائے۔

فضلہ کے ڈھیر

سحر زمان لاہور سے لکھتی ہیں کہ ترقی اور سیاحت کے نام پر فطرت کو برباد کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ مری، جو کبھی خاندانوں کے لیے موسم گرما کی تفریحی جگہ سمجھا جاتا تھا، اب ایک کنکریٹ کا جنگل بن گیا ہے جس میں کچرے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ شمال میں تھوڑا آگے، گلیات کا علاقہ غیر منصوبہ بند تعمیرات اور زوننگ کے ساتھ اس کی

ماحولیاتی لچک۔ منصوبہ بندی میں مرکزی حیثیت

پیروی کر رہا ہے۔ پہاڑوں میں کثیر المنزلہ عمارتیں معمول کے مطابق ہیں جن میں سیوریج اور کچرے کو ٹھکانے لگانے، پارکنگ کی جگہوں یا عمارت کے بنیادی قوانین پر کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے۔ زیرو پوائنٹ جیسی جگہوں پر بھی کچرے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، جہاں ہر طرف پلاسٹک کی بوتلیں اور ریپر بکھرے ہوئے ہیں، جو اردگرد کے نازک ماحولیاتی نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں۔ ہم پاکستان کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان ممالک میں سے ایک ہے جو موسمیاتی تبدیلیوں کے شدید خطرے سے دوچار ہیں، لیکن ہم اس موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ کیا جنگلات کی کٹائی اور نئی تعمیرات کی کوئی جانچ پڑتال ہے، خاص طور پر گلیشیئرز کے قریب کے علاقوں میں؟ پہاڑوں میں کچرے کو ٹھکانے لگانے کا ایک بھی یونٹ نہیں ہے۔ کچرا یا تو جلا دیا جاتا ہے یا پھر دریا میں پھینکا جاتا ہے۔ حکومت کو اپنی نیند سے بیدار ہونے کی ضرورت ہے اور دکانوں اور بازاروں کی تعداد کو محدود کرتے ہوئے نئی تعمیرات پر نظر رکھنے کے لیے موثر اقدامات اور حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دریاؤں اور جھیلوں کے کناروں پر ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کو کام کرنے کی اجازت بالکل نہیں ہونی چاہیے۔

بڑھتی ہوئی آبادی

شہر یار عبداللہ کوئٹہ سے اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ پاکستان جن بے شمار مسائل سے دوچار ہے ان میں سے ایک آبادی میں بے لگام اضافہ ہے۔ 2.55 فیصد کی موجودہ شرح نمو کے ساتھ، پاکستان کا شمار دنیا کی سب سے تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادیوں میں ہو رہا ہے۔ پہلے ہی ملک کی آبادی 240 ملین سے زیادہ ہے اور 2030 تک 300 ملین سے تجاوز کرنے اور 2050 تک 400 ملین تک پہنچنے کا امکان ہے۔ اس 'ترقی' کے نتائج ہر شعبے میں نظر آ رہے ہیں۔ پاکستان کو پہلے ہی صاف پانی، بجلی اور رہائش کے حوالے سے شدید قلت کا سامنا ہے۔ صحت کی دیکھ بھال کا نظام حد سے زیادہ پریشان کن ہے، تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ تباہ ہو رہا ہے، اور خوراک کی عدم فراہمی لاکھوں لوگوں کو متاثر کر رہی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے یعنی 60 فیصد پاکستانیوں کی عمر 25 سال سے کم ہے۔ اگرچہ نوجوانوں کی یہ اکثریت تعلیم، روزگار کی تخلیق میں معاشی طاقت کا محرک ثابت ہو سکتی ہے لیکن نوجوانوں کی بڑی تعداد سماجی بدامنی، جرائم اور بنیاد پرستی کا شکار ہے۔ جو چیز اس بحران کو مزید سنگین بناتی ہے وہ پاکستان میں آبادی پر قابو پانے کے حوالے سے پالیسی میں خلا ہے جس کے بھیانک نتائج مرتب ہونے جا رہے ہیں۔

والدین کی تعلیم کے عمل میں موجودگی

طوبیٰ طارق اپنے خط کے ذریعے تعلیم میں والدین کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ دنیا بھر میں ہونے والی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ طلباء اس وقت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جب والدین تعلیمی اداروں میں فعال طور پر شامل ہوتے ہیں۔ تعلیم ایسی چیز نہیں ہے جو کلاس روم میں شروع ہو اور وہیں ختم ہو جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ اسکول کتنا ہی اچھا ہو، اگر گھر میں والدین کی طرف سے تعاون نہ کیا جائے تو اساتذہ کی ساری کوششیں ناکام ہو سکتی ہیں۔ اب والدین کی شمولیت اختیاری نہیں رہی بلکہ اب یہ ضروری ہے۔ پاکستان میں، ہم اس حوالے سے ایک خاموش بحران کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ والدین فیس ادا کرنے اور کتابیں اور یونیفارم خریدنے کے بعد اپنا کام مکمل ہوتا دیکھتے ہیں۔ ایک بچے کی تعلیم کی تشکیل روزمرہ کے تجربات، گھریلو گفتگو، اور جذباتی مدد سے ہوتی ہے یہ وہ چیزیں ہیں جو صرف والدین فراہم کر سکتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں، بنیادی وجہ غفلت نہیں بلکہ تھکن ہوتی ہے، بڑھتی ہوئی مہنگائی کے دباؤ میں والدین طویل اوقات تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ امر نااہلی اور یہاں تک کہ جہالت کا

پہاڑوں اور ملحقہ علاقوں میں کچرے کے ڈھیر

اشارہ بھی دیتا ہے۔ والدین کا دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ بچوں سے اسکول میں ان کے دن کے بارے میں پوچھنا، پی ٹی ایم میں شرکت کرنا یا صرف ان کی حوصلہ افزائی کرنے سے فرق پڑسکتا ہے۔ ہر چیز کے لیے محض اسکولوں اور اساتذہ پر الزام ٹھہرانا ایک قومی عادت بن چکی ہے۔ تعلیم گھر اور اسکول کے درمیان مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیے۔ استاد سکھا سکتے ہیں لیکن بنیاد صرف والدین ہی بنا سکتے ہیں۔ بچوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ والدین ہیں۔

اے آئی اور انسانی دماغ

عروبہ غزل لکھتی ہیں کہ کچھ عرصہ قبل امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایران جو کہ بلا اشتعال فوجی حملوں کا ہدف تھا کو ''مشرق وسطیٰ کا غنڈا'' کہا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ ذہن رکھنے والے لاکھوں لوگ ٹرمپ کے نظریے سے متفق نہیں ہیں۔ چونکہ مصنوعی ذہانت (AI) کے دور میں AI ہمارا اجتماعی اور پسندیدہ پلیٹ فارم بن گیا ہے، اس لیے میں نے ایک چھوٹے سے تجربے کے لیے لارج لینگویج ماڈلز (LLMs) کا رخ کیا۔ AI ثابت شدہ کوتاہیوں کے باوجود سچائی کا ایک اہم ذریعہ بن کر ابھرا ہے۔ تاہم اس کے الگورتھم میں وہی تعصب ہے جو ان کے پیچھے والے افراد کے ذہنوں میں ہے۔ میں نے ChatGPT سے پوچھا کہ مشرق وسطیٰ کا بدمعاش کون ہے، اور ایک لفظی جواب دینے کے لیے ایک خصوصی ہدایت دی۔ اس نے آسانی سے کہا کہ ایران ہے۔ دوسری طرف جب میں نے اسی جملے کو DeepSeek میں کاپی پیسٹ کیا تو اس نے کہا کہ اسرائیل ہے۔ دو مختلف ماڈلز، دو مختلف جوابات۔ جب میں ایک امتحان کی تیاری کر رہی تھی، میں نے ڈیپ سیک سے 21 ویں صدی میں چین کے معاشی اور سیاسی نظام کے بارے میں پوچھا تھا۔ ایک لمبا جواب تیار کرنے کے بعد، اس نے فوری طور پر تیار شدہ آؤٹ پٹ کو یہ کہتے ہوئے ہٹا دیا کہ اس سوال کا جواب دینے تک اسے رسائی حاصل نہیں ہے۔ اگر AI مستقبل بن جاتا ہے تو ہم انسان کسی بھی معلومات کے بارے میں تجزیاتی سوچ اور فطری انسانی شکوک وشبہات کو آؤٹ سورس کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے ہیں۔ لوگوں کو AI کو ذہانت سے استعمال کرنا چاہیے اور AI سے حاصل کردہ مواد کی تصدیق کرنے کی انسان کو مکمل آزادی ہونی چاہیے۔

لاہور کی سڑکوں پر سماجی انقلاب

صبا لیاقت لکھتی ہیں کہ لاہور کی گلیوں میں ایک خاموش مگر نظر آنے والا انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ اس میں احتجاج یا باغی سیاسی گروہ شامل نہیں ہیں۔ یہ تبدیلی خود انحصاری، اعتماد اور سہولت کے بارے میں ہے۔ موٹر سائیکلیں بشمول ای بائک اور اسکوٹی خواتین کے لیے آزادی کی علامت بن رہی ہیں۔ گھریلو خواتین جو کبھی سماجی دباؤ کی وجہ سے اپنے گھروں تک محدود رہتی تھیں، اب اپنے بچوں کو لے کر اسکوٹر پر روزانہ کام کرتی نظر آتی ہیں۔ بسوں اور رکشوں کے انتظار سے شہر کی سڑکوں پر آزادانہ طور پر سواری کی طرف منتقلی شہری نقل و حرکت میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ٹریفک سگنلز پر، شہر کی ہلچل والی سڑکوں پر، یا بازاروں اور پارکنگ کی جگہوں پر اسکوٹر پر خواتین کا نظر آنا عام ہوتا جا رہا ہے۔ اسکوٹیز کے مختلف ڈیزائن، رنگوں اور شکلوں نے خواتین کو ان کا انتخاب کرنے کی طرف راغب کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ای بائک خاص طور پر خواتین کو پسند ہیں کیونکہ وہ چلانے میں زیادہ آسان ہیں، گھر پر چارج کی جاسکتی ہیں، اور اس کو کم سے کم دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ موٹر بائک کو کبھی مردانہ بالادستی کے طور پر دیکھا جاتا تھا، لیکن خواتین اب اپنی نقل وحرکت پر قابو حاصل کر رہی ہیں، اور روزانہ کے کام خود انجام دے رہی ہیں۔

اے ٹی ایم کی بے وقوفی

یہ خط کراچی سے اے ٹی ایم کارڈ ہولڈر کے نام سے شایع ہوا جس میں اے ٹی ایم کے حوالے سے پیش آنے والے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آٹو میٹڈ ٹیلر مشین (اے ٹی ایم) کا مقصد بینک کھاتہ داروں کو سہولت فراہم کرنا ہے۔ یہ بینک بند ہونے پر بھی انہیں رقم

آبادی پر قابو پانے میں پالیسی خلاء

حاصل کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ نہ صرف بینکنگ اوقات کے بعد بلکہ اختتام ہفتہ اور تعطیلات پر بھی۔ نیز، پاکستان میں بینک معمول کے مطابق قومی تعطیلات سے پہلے اشتہارات چلاتے ہیں، جس میں دھوکہ دہی کے انتباہ کے ساتھ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ان کے کلائنٹ تعطیلات کے دوران پاکستان بھر میں اپنے ATM سے رقم نکال سکتے ہیں۔ سچ کہوں تو اس سے بڑا جھوٹ نہیں ہوسکتا، کیونکہ زیادہ تر اے ٹی ایم ایسے مواقع پر کام نہیں کرتے۔ لوگوں کو عام طور پر اے ٹی ایم اسکرین پر ایک نوٹس ملتا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ بعض اوقات، ایسا کوئی نوٹس نہیں ہوتا ہے، اور جب لوگ اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ آخر کار ایک فعال ATM مل گیا ہے اور جلد بازی میں ATM کارڈ ڈالتے ہیں، تو اسکرین پر ایک نشان نمودار ہوتا ہے، جو انہیں مطلع کرتا ہے کہ کوئی نقد رقم دستیاب نہیں ہے، اور یہ کہ وہ بعد میں کوشش کریں۔ صرف ایک احمق ہی اس نشانی پر یقین کرے گا اور بعد میں کوشش کریں جب تک کہ چھٹیاں ختم نہ ہو جائیں اور زندگی معمول پر آجائے کیونکہ اس کے بعد ہی بینک اے ٹی ایم کو دوبارہ بھرتے ہیں۔ ❀

گلیشیر۔ ہمارے آبی بینک

"نازیہ آصف اطراف کی قلمی سرپرست بہت محنت اور تحقیق سے کسی موضوع پر تحریر سے نوازتی ہیں۔ حالیہ سیلابوں کے بارے میں اطراف کی گزارش پر انھوں نے بہت معلوماتی مضمون قلمبند کیا۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ یہ تحریر قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔"

پانی کی گذرگاہوں پر ہاؤسنگ سوسائٹیاں ممنوع

تحریر: نازیہ آصف، گجرات

" جو عبرت سے نہ سمجھے، دلائل بھی نہ مانے تو
قیامت خود بتائے گی، قیامت کیوں ضروری تھی" ۔

پاکستان جغرافیائی حوالے سے خط استوا کے شمالی کرے میں واقع ہے۔ خط استوا سے دور واقع مما لک کو اللہ پاک نے یہ خاصیت بخشی ہے کہ وہاں موسم بدلتے رہتے ہیں موسموں کے اس تغیر میں کئی بھید پوشیدہ ہیں۔ ملک خداداد کے لیے ان میں سے ایک بڑا بھید ان پہ جمے گلیشیر ہیں۔

پاکستان کے شمال میں واقع وسیع تر ہمالیہ، قراقرم، کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلے اور ان پہ جمی برف ہمارے لیے لائف لائن ہے۔ یہ ہمارے آبی بینک ہیں۔

گلوبل وارمنگ کے اس دور میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے مما لک میں پاکستان پہلے نمبر پہ ہے۔ اگرچہ گلوبل وارمنگ کی سب سے بڑی وجہ گرین گیسز کے اخراج میں پاکستان کا حصہ صفر یے، مگر پھر بھی پاکستان پہ اس گلوبل وارمنگ کے بدترین اثرات ہم گزشتہ چند سالوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ اسی وارمنگ کا نتیجہ ہے کہ سردیاں سکڑتی جا رہی ہیں اور گرمیاں شدید تر ہوتی جا رہی ہیں، ہر سال گرمی پچھلے ریکارڈ توڑ رہی ہے۔ جس سے ہمارے یہ آبی بینک مسلسل دیوالیہ ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

حالیہ بارشیں، کلاؤڈ برسٹ ہونا، گلیشیرز کا ٹوٹنا اور سیلاب، یہ سب کلائمیٹ چینجز کی بہت الارمنگ نشانیاں ہیں۔

پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں تین ہزار سے زائد گلیشیر موجود ہیں۔ جن میں دنیا کے طویل ترین گلیشیر جیسے سیاچن گلیشیر، بالتورو گلیشیر، ہسپر گلیشیر، بیافو گلیشیر موجود ہیں۔ اگرچہ گلیشیروں کا یہ پگھلاؤ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ سمندری برف، انٹارکٹیکا اور گرین لینڈ کے گلیشیر وں پہ بھی یہ عمل سرعت سے جاری ہے۔

امریکن انسٹی ٹیوٹ ورلڈ واچ نے خدشہ ظاہر کیا یے کہ اگر گلوبل وارمنگ ایسے ہی جاری رہی تو دنیا کے کئی شہر ہی نہیں بلکہ ملک بھی بہت جلد زیر آب آ جائیں گے۔ جن میں پاکستانی شہر کراچی، بدین، ٹھٹھہ اور خوبصورت جزیرہ نما ملک مالدیپ فہرست ہیں۔

ماہرین کے ایک اندازے کے مطابق اٹھارہ سو ستر سے اب تک آٹھ انچ سمندر کی سطح بڑھی ہے

گلوبل وارمنگ سے سمندروں کی بڑھتی سطح اب کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو خطرے میں دھکیل رہی ہے۔

قارئین بادی النظر میں پہاڑ، گلیشیر، بارشیں، بہتے دریا یہ سب اللہ پاک کی بہت بڑی رحمتیں ہیں مگر ہم ان رحمتوں کو زحمتوں میں بدل رہے ہیں۔ ہم ایک طرف تیزی سے ڈوبنے کی طرف جا رہے ہیں تو دوسری طرف ہم بہت شدومد سے خشک سالی کا شکار ہونے جا رہے ہیں۔

ہمارے شمالی علاقے ہی نہیں بلکہ، میدانی علاقوں کی آبپاشی کا انحصار بھی انھیں دریاؤں پر ہے جن کی سارا سال روانی کا منبع یہی گلیشیرز ہیں اور ان کا یوں ٹوٹنا ہمیں ایک بہت بڑے المیے کی طرف بھی لے جا سکتا ہے۔

عالمی سٹینڈرڈ کے مطابق ہر ملک کے پاس اوسطاً 120 دنوں کے لیے پانی کا ذخیرہ موجود ہونا لازم ہے جبکہ ہم اپنے ہاتھوں سارا پانی لٹا کر صرف 30 دن کے لیے ہی پانی ذخیرہ کر پا رہے ہیں۔ جبکہ

گلیشیر۔ ہمارے آبی بینک

ہمارے مقابلے میں چائنا ایک ہزار دن اور انڈیا 120 سے 220 دنوں تک کے پانی کا ذخیرہ کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں جتنا پانی ان دو ماہ میں موجود تھا، ہم عقلمندی سے کام لے کر سال بھر کی متعدد ضروریات پوری کر سکتے تھے مگر ہم موجودہ پانی کا صرف 10٪ ہی سٹور کر پاتے ہیں جبکہ باقی 90٪ فیصد پانی سمندر برد ہو جاتا ہے،

اگر ہمارے ہاں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہوتی تو انڈیا ہمیں پانی بند کرنے کی دھمکی دینے کی پوزیشن میں ہوتا اور نہ ہم اس دھمکی کو

ہمارا پانی کا ذخیرہ صرف 30 دن کا

آبی جارحیت کا نام دیتے۔

چائنا ہزار دنوں کی واٹر سٹوریج کے باوجود اپنے آبی بینک یعنی ڈاگو گلیشیر کو سفید شیٹ سے ڈھانپ رہا ہے۔ یہ سفید شیٹ گلیشیر اور

سورج کی سخت شعاعوں کے آگے ایک مضبوط بیریئر ثابت ہوگی اور برف کے پگھلنے میں بہت بڑی مزاحمت بھی ہوگی جس سے گلیشیر کی زندگی بڑھے گی۔

مگر عظیم ترین تین پہاڑی سلسلوں کی مالک اس سرزمین کی خوش قسمتی یوں بدقسمتی میں بدلتی ہے کہ ہم اس ہمالیائی خطے میں سب سے نشیبی علاقے میں رہ رہے ہیں۔اس لیے تبت کے ذیلی سلسلے کیلاش سے نکلنے والا سندھو دریا، ہماچل سے نمو پانے والا راوی اور چندرا، بھاگا سے تشکیل پانے والا چناب، عظیم سلسلہ ہائے کوہ سے جنم لے کر گنگا جمنا کے دیس سے ہوتے ہوئے ہماری ارض پاک کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ٹوٹتے گلیشیروں سے پیدا ہونے والے سیلابوں اور ان عظیم دریاؤں کے سواگت کے لیے کیا کیا ہے۔۔۔ ؟ ہم نے تو ہاؤسنگ سوسائٹیز کے نام پہ ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

پارلیمنٹ میں اپنی تنخواہوں میں پانچ سو فیصد اضافے پہ یکلخت متفق ہو جانے والے عوامی مفاد کے لیے کیوں متحد نہیں ہو سکتے، وقت کی پکار ہے کہ ہم اپنی آنکھیں کھولیں اور

1۔۔۔طویل عرصے تک ہاؤسنگ سوسائٹیز پہ پابندی لگائیں ، کنالوں، مربعوں پہ مشتمل گھروں کی بجائے اپارٹمنٹس کو فروغ دیا جائے،

٭ جس سے جگہ کی بچت اور آبادی کا کھپاؤ زیادہ ہو سکے گا،

٭ وسیع ایریے میں واٹر سپلائی، سسٹم، برقی نظام، اور سیوریج سسٹم بھی محدود ہو جائے گا۔

٭ زمین کی بچت سے ایک وسیع علاقہ کنکریٹ میں بدلنے سے بچ جائیگا، جسے ہم زراعت یا کئی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں گے۔

2۔ دریاؤں اور برساتی نالوں کے قدرتی بہاؤ کے راستوں کو

چین اپنے گلیشیرز۔ سفید چادر سے ڈھانپ رہا ہے

واگزار کروا کر محفوظ بنائیں۔

٭ کیونکہ حالیہ سیلابوں کے مشاہدے سے یہی بات سامنے آئی ہے کہ وہ علاقے پانی سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں جو پانی کی گذرگاہوں پہ قبضہ کر کے بنائے گئے تھے۔

٭ ان گذرگاہوں کی نشان دہی کر کے ان کے کناروں پہ فینسی درختوں کی بجائے اپنے پرانے روایتی درخت جیسے کیکر، شیشم، نیم، جامن اور آم کے پیڑ لگائے جائیں، کیونکہ مضبوط درخت زمین کے کٹاؤ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

٭ گلوبل وارمنگ کی دوسری بڑی وجہ فضائی آلودگی میں اضافہ ہے۔

پاکستان ہمالیائی خطے میں سب سے نشیبی علاقے میں

کاربن کا سب سے بڑا دشمن درخت ہیں۔ جو کاربن کو پی جاتے ہیں ۔لیکن یاد رہے پٹرول میں کاربن تو درخت جذب کر لیتے ہیں مگر سلفر، لیڈ، نائٹروجن آکسائیڈ اور میگنیز کے آگے درخت بھی بے بس ہیں۔

4...لازم ہے کہ کیمیائی زہریلے اجزاء میں کمی کے لیے گورنمنٹ اعلیٰ کوالٹی کا پٹرول درآمد کرے تاکہ فضا صاف رہے اور درجہ حرارت نیچے آسکے۔

5. پرائیویٹ گاڑیوں کی جگہ پبلک ٹرانسپورٹ کا فروغ لازم ہے۔

6....پہاڑوں پہ اور سمندر کنارے مینگروز کے جنگلات کی تیزی سے کم ہوتی ہوئی شرح ٹمبر مافیا کے علاوہ متبادل ایندھن کا بہت مہنگا ہونا ہے۔حکومت گیس پٹرول اور انرجی کے دوسرے ذرائع سستے کرے تاکہ جنگلات کو محفوظ کیا جا سکے۔

قارئین درجہ حرارت نیچے آئے گا تو گلیشیروں کا پگھلاؤ کم ہوگا، پگھلاؤ کم ہوگا تو بارشوں اور سیلاب سے بچت ہوگی۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ جلد انسانی آبادی ایک بہت بڑا المیہ بن جائے کیونکہ جتنی تیزی سے گلیشیر ٹوٹ رہے ہیں اور سیلاب کم وبیش پاکستان کے ہر علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں غذائی کمی ایک بہت بڑے قحط کی صورت میں نمودار ہو سکتی ہے۔

ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اب عالمی بینک بھی ہمیں خبردار کر رہا ہے کہ پاکستان میں صوبوں کے درمیان پانی کے مسلے پر بڑھتی ہوئی چپقلش پانی کا باقاعدہ نظام وضع کرنے میں بڑی رکاوٹ ہے۔

اگر اب بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں تو پھر ہمیں ایک ہی فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم نے ڈوب کر مرنا ہے یا سوکھ کر

"جو عبرت بھی نہ سمجھے ، دلائل بھی نہ مانے تو
قیامت خود بتائے گی قیامت کیوں ضروری تھی" ❁

مریم ارشد۔ کالم نویس۔ افسانہ نگار اور مصور بھی ہیں۔ اطراف کی قلمی سرپرست ہیں۔ اطراف کی درخواست پر انھوں ے سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے پیشگی اقدامات پر ٹھوس تجاویز سے نوازا ہے۔ بہت با مقصد۔ مختصر مگر جامع تحریر: پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

عوامی تربیت سے نقصانات کم کیے جا سکتے ہیں

تحریر: مریم ارشد۔ لاہور

صوبہ پنجاب کی سرزمین پاکستان کا زرعی دل ہے، یہاں پانچ دریا سندھ، جہلم، ستلج، چناب اور راوی بہتے ہیں تو یہ زمین پنج آب بھی کہلاتی ہے۔ دریاؤں کے کناروں پر لہلہاتے کھیت، چاول، نہریں اور برستی بارشوں کے بعد مٹی کی سوندھی خوشبو سب اس خطے کی پہچان ہیں۔ لیکن اکثر یہی دریائی نظام بارشوں اور پہاڑی علاقوں سے آنے والی طغیانی کے باعث خطرہ بن جاتا ہے۔ پنجاب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہر سال سیلاب آنے کے باوجود ہم مستقل بنیادوں پر انفراسٹرکچر نہیں بناتے۔ وقتی طور پر ریلیف کے منصوبوں پر اربوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں مگر طویل مدتی منصوبے ہمیشہ ہی نظر انداز ہوتے ہیں۔ ہم دہائیوں سے یہ بھی سُنتے آئے ہیں کہ انڈیا نے آبی جارحیت کر دی راتوں رات پانی چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے جب قدرتی آفت کے طور پر سیلاب آئیں گے اور بھارت کے پاس بے شمار ڈیمز ہونے کے باوجود پانی زیادہ ہو جائے گا تو وہ ان کے پاس بھی اپنے بند توڑنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔ اگر ہمارے پاس بھی چھوٹے ڈیمز، مضبوط حفاظتی بند، جدید وارننگ سسٹم اور شجر کاری جیسے اقدامات کیے جائیں تو آئندہ نسلوں کو یقیناً بڑی تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ دریا کا بہاؤ پہاڑوں کی چوٹیوں سے نکل کر وادیوں کو چھوتا ہوا میدانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کی موجیں شوخ دو شیزاؤں کی طرح کلکاریاں مارتی ہوئی اٹھلاتی ہیں تو کبھی پُر سکون صوفیوں کے دھیمے سرگم سناتی ہیں۔ دریاؤں کے کناروں پر بیٹھ کر ایک عجب سا سکون ملتا ہے اور جی چاہتا ہے اپنی ساری تھکن اس کے سپرد کر دیں۔ مگر جب انہی دریاؤں میں طغیانیوں کا طوفان بپا ہو جاتا ہے تو ان کے کناروں پر بسنے والے لاکھوں افراد اپنی جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ افسوس در افسوس! کہ یہ منظر ہر سال دیکھنے کو ملتا ہے مگر ہماری حکومتیں کچھ سیکھتی ہی نہیں۔ پنجاب ڈیزاسٹر مینجمنٹ کے مطابق ہر سال ہی ہزاروں خاندان بے گھر ہوتے ہیں۔ ان کے مال مویشی بہہ جاتے ہیں، ہرے بھرے کھیت ریت اور کیچڑ تلے تب جاتے ہیں۔ بچے، بوڑھے اور خواتین وبائی امراض کا شکار ہو کر مشکلات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی ایک سہیلی کے توسط سے اس کے بھائی جو آبپاشی کے ماہر انجینئر ہیں سے پوچھا سیلاب سے پہلے ہی پیشگی حفاظتی انتظامات کر کے نہ صرف

قیمتی انسانی جانیں بچا کر معیشت کو بھی بڑے نقصان سے کیسے محفوظ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قیمتی رائے سے ہمیں کچھ اس طرح معلومات فراہم کیں کہ:

ڈیم اور بیراج کی دیکھ بھال:

پنجاب تربیلا اور منگلا جیسے بڑے ڈیم بے شک وفاق کے ماتحت ہیں لیکن مقامی بیراج مثلاً تریموں، پنجند، مرالہ اور سدھنائی کی مضبوطی اور بروقت بلکہ قبل از وقت مرمت ناگزیر ہے۔ ہر سال برسات کے آنے سے پہلے ہی ان تمام بیراجوں اور ڈیموں کے حفاظتی بندوں اور گیٹوں کا معائنہ اور مضبوطی لازمی ہے تاکہ پانی کا اچانک دباؤ برداشت کیا جا سکے۔

دریاؤں کے کناروں کے گرد مضبوط بند:

دریائے راوی، ستلج اور چناب کے کناروں پر حفاظتی بند چونکہ بوسیدہ ہو چکے ہیں لہذا جب بھی ان کی بروقت مرمت نہیں ہوتی تو پانی آبادیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ لہذا قبل از وقت ہی یہ مضبوط بند باندھنے انتہائی ضروری ہیں۔

آبادی کی منتقلی اور ایمرجنسی پلان:

جو دیہات دریاؤں کے کناروں پر بسے ہوتے ہیں انہیں سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ حکومت کو چاہیئے یا تو ان دیہات کے گرد حفاظتی پُشتے لگائے یا پھر ہر سال جون کے مہینے سے قبل ہی ان علاقوں کے لیے عارضی کیمپ اور متبادل رہائش گاہوں کے بندوبست کرے۔ دریاؤں کے کناروں اور برساتی نالوں پر غیر قانونی ہاؤسنگ سکیمیں اور بستیاں سیلاب کے خطرات کو بڑھاتی ہیں۔ جب تک

سخت قوانین اوران پرعمل درآمد نہیں ہوگا یہ مسئلہ بڑھتا ہی جائے گا۔

پنجاب میں مستقل بنیادوں پر انفراسٹرکچر نہیں ہے

قدرتی نالوں اور ڈرینج سسٹم کی بحالی:
پنجاب میں کئی پرانے برساتی نالے بند کر کے ان پر غیر قانونی

بستیاں قائم کر دی ہیں۔ ان نالوں اور برساتی دریچوں کی بحالی اور مستقل صفائی کے بغیر بارش کا پانی شہروں کی گلیوں میں جمع ہوتا رہے گا۔ لاہور، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے بڑے شہروں میں پانی جمع ہونے کی یہی سب سے بڑی وجہ بنی۔

سیٹلائٹ تصاویر، ڈورن، کیمروں کے ذریعے خطرناک مقامات کی نشاندہی

فلڈ وارننگ سسٹم اور سیٹلائٹ کی نگرانی:
آج ٹیکنالوجی کی جدید دنیا میں بارش اور پانی کے بہاؤ کی پیش گوئی ممکن ہے۔ فلڈ وارننگ سسٹم کو ہر ضلع اور تحصیل تک فعال کرنے سے کسان بروقت احتیاطی تدابیر اختیار کریں گے تو نقصانات کا اندیشہ کم سے کم ہوگا۔ سیٹلائٹ تصاویر، ڈرون کیمروں اور جی آئی ایس میپنگ کے ذریعے خطرناک مقامات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

ویٹ لینڈز اور قدرتی جنگلات کا تحفظ:
درخت ہماری دنیا کا وہ لازمی جُزو ہیں جو ہمیں نہ صرف آکسیجن مہیا کرتے ہیں بلکہ بارش کے پانی کو زمین میں جذب کر کے بہاؤ کو آہستہ کرتے ہیں۔ پنجاب میں دریاؤں کے کناروں پر موجود

ہر سال ڈیم اور بیراجوں کی پہلے سے دیکھ بھال

جنگلات کو کاٹ دینے سے پانی کی رفتار زیادہ ہو کر تباہی کا باعث بنتی ہے۔ ہمیں نئے سرے سے شجرکاری اور ویٹ لینڈ کی بحالی کی اشد ضرورت ہے۔

زرعی زمینوں کے لیے حکمت عملی بنانا:
اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیلابی پانی کھڑی فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے کسانوں کو سیلاب کے متوقع زرعی زمینوں کے علاقوں میں کم مدت میں تیار ہونے والی فصلیں اگانے کی ترغیب دی جائے۔ مزید برآں حکومت کو چاہیئے کہ فلڈ زون میں اُگائی جانے والی فصلوں کی انشورنس کی سکیمیں متعارف کروائے تاکہ غریب اور چھوٹے کسان کا نقصان پورا کیا جاسکے۔

عوامی شعوری تربیت:
شدید سیلاب کے وقت زیادہ نقصان عوامی لاعلمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ضلع میں ریسکیو 1122 اور سول ڈیفنس کے زیرانتظام عوام کو سیلابی صورتِ حال سے نمٹنے کی عملی تربیت دینی چاہیئے۔ دیہاتوں میں کمیونٹی بیسڈ فلڈ مینجمنٹ کمیٹیاں بنائی جائیں جو ایمرجنسی اقدامات اُٹھاسکیں۔

یہ ہیں وہ چند اہم احتیاطی تدابیر جن پر عمل کیا جائے تو آئندہ سیلابی ریلوں کے شدید نقصانات سے بچا جاسکتا ہے۔ پنجاب کے کسانوں

دریا کنارے دیہات میں عارضی کیمپ متبادل رہائش گاہیں

کی محنت، مزدوروں کا پسینہ اور بچوں کی ہنسی صرف اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب ہم سیلاب سے قبل احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔ یہ تدابیر بحیثیت قوم ہمارا اجتماعی فریضہ ہیں۔ اگر انفرادی طور پر یا مختلف این۔ جی اوز بیداری اور ذمہ داری کا مظاہرہ کریں تو سیلاب کی تباہ کاریاں کم سے کم ہوسکتی ہیں۔ دریاؤں کے بپھرنے کے ساتھ ہمیں بھی عقل، تدابیر اور اتحاد سے کام لینا ہوگا۔ ❁

سیلاب نے پاکستان کے تین صوبوں اور دو وحدتوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ اطراف نے پشاور میں اپنے نمائندہ خصوصی سے گزارش کی کہ وہ خیبر پختونخوا میں سیلاب کی تباہ کاریوں کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ تاکہ اطرف کے پاکستان اور بیرون پاکستان قارئین اس آفت کے اثرات سے باخبر ہوسکیں۔ ان کی تفصیلی رپورٹ ملاحظہ کریں۔ اوراپنی رائے سے نوازیں۔

پانچ سال میں سیلاب کا نقصان 250 ارب ڈالر تک پہنچ سکتا ہے

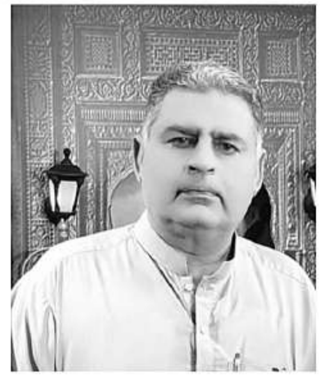

تحریر: عمر حیات، پشاور

15 اگست کو خیبر پختونخوا کے پانچ اضلاع میں اچانک کلاؤڈ برسٹ ہوا اور تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس کے بعد سیلابی ریلوں نے کئی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بونیر میں سب سے زیادہ جانی نقصانات ہوا جبکہ دیگر اضلاع جیسے سوات، باجوڑ، شانگلہ، بٹگرام اور صوابی میں بھی سیلاب نے بڑے پیمانے پر املاک، مویشیوں اور زراعت کو نقصان پہنچایا ہے۔

قدرتی آفات سے نمٹنے والے صوبائی ادارے پی ڈی ایم اے کے مطابق فلیش فلڈز میں ہلاکتوں کی تعداد 390 سے تجاوز کرچکی ہے۔

پشاور جو صوبے کا دارالحکومت بھی ہے پچھلے دنوں ایک دو گھنٹے کی بارش نے پورے پشاور کو جل تھل کردیا ہر طرف پانی ہی پانی کوئی نکاسی کا راستہ نہیں تھا ایک فٹ پاتھ سے دوسرے فٹ پاتھ تک دریا جیسا سماں تھا سکول گاڑیاں سکول جانے والے آفس جانے والے رکشے تانگے سوزوکیاں سب پھنس گئیں کچھ لوگ اس کو سیاسی نظر سے دیکھتے ہیں کچھ لوگ اس کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن کسی کو بھی اپنی غلطی نظر نہیں آتی پشاور کے لوگ کوڑا کرکٹ نالیوں میں پھینکتے ہیں پلاسٹک اور شاپرز سے پورے شہر کے نالے بھرے ہوئے ہیں۔ صفائی والا محکمہ کہاں تک صاف کرے وہ آگے آگے صاف کرتا ہے پیچھے سے عوام دوبارہ کچرا پھینک دیتے ہیں۔ پشاور میں ویسے بھی بارشیں کم ہوتی ہیں لیکن اگر ہوجائے تو سارے نالے بلاک ہوتے ہیں اس میں اگر حکومت کا 60 پرسنٹ قصور ہے تو عوام کا بھی 40 پرسنٹ قصور ہے۔ پشاور کے لوگ جو کہ بونیر سوات کے لوگوں کے لیے امدادی فنڈ اکٹھا کررہے تھے خود آفت کا شکار ہوگئے۔ یاد رکھیے سیلاب تب آتے ہیں جب ایک بہت وسیع وعریض بڑے علاقے پر کم ازکم 48 گھنٹے زوروں کی بارش ہو جائے یا گلیشیرز پر آسمانی بجلی قدرتی یا مصنوعی گرادی جائے تو پھر اچانک زوروں کے خطرناک سیلاب آتے ہیں۔

''دریا راستے تک نہیں آیا بلکہ راستہ دریا کی حدود میں چلا گیا''

پاکستان میں یہ آفات اب کوئی 'غیر معمولی' واقعہ نہیں رہیں بلکہ معمول بن چکا ہے اور ہم سے فیصلہ کن کارروائی کا مطالبہ کررہا ہے۔ اگر ہم موسمیاتی تبدیلیوں سے بچنے کے لیے عملی اقدامات میں تاخیر کرتے رہے تو صرف اگلے پانچ سالوں کے اندر ہماری اس بے عملی کی لاگت 250 ارب ڈالر تک پہنچ سکتی ہے۔ صرف اکیلے سیلاب سے 2050 تک پاکستان کو 60 ارب ڈالر کے نقصانات ہو سکتے ہیں۔

اس سال 2025 کے کلائمیٹ رسک انڈیکس میں پاکستان کو موسمیاتی تبدیلیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک قرار دیا گیا ہے حالانکہ پاکستان کا حصہ موسمیاتی تبدیلی کا باعث بننے والی گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں صرف 1 ٪ ہے۔

یہ کام اب فوری ہونے چاہئیں۔

1- جنگلات کا بے دریغ کٹاؤ بند ہونا چاہیے۔

2- دریاؤں، ندی نالوں اور سیلابی راستوں کی نشاندہی ہو کر ان میں انسانی آبادیوں پر پابندی ہونی چاہیے۔

3- ماحولیاتی ماڈلنگ، سیلاب کی پیش گوئی اور سیلاب کے انتباہ کے نظام ہونے چاہئیں جو کہ ڈیجیٹل دور میں کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

4- آفت زدہ علاقوں میں ریسکیو اور ریسپانس کی ایپ ہونی چاہیے۔

5- سیاحوں کی ممکنہ طور پر سیلابی علاقوں میں آمدورفت مانیٹر ہو۔

6- پلوں، سڑکوں اور دیگر تعمیرات کے سٹینڈرڈ اور کوڈ موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کے لحاظ سے اپ گریڈ ہوں۔

7- موسمیاتی آفتوں سے بچاؤ سے منسلک تمام محکموں کا آپس میں

پی ڈی ایم اے کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد 390 سے زیادہ

گہرا ربط بنانا چاہئے اور ان محکموں میں کام کرنے والے فیصلہ سازوں اور کارکنان کی موسمیاتی تبدیلیوں کی جدید سائنس پر تربیت اور کیپیسٹی بلڈنگ کرنا چاہئے۔

8۔ عالمی اداروں سے موسمیاتی انصاف کے تقاضوں کے مطابق

آفتوں سے نمٹنے کے لیے مدد اور ان سے بچنے کے منصوبوں کے لیے فنڈنگ لانی چاہئے۔

9۔ عوامی سطح پر موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات سے بچاؤ کے لئے شعور بیدار کرنا چاہئے اور عوام الناس کی تربیت کرنی چاہئے اس سیلاب کو خیبر پختونخوا کے مختلف اضلاع میں حالیہ بارشوں، بادل پھٹنے اور تباہ کن سیلاب کے دوران سوشل میڈیا پر افواہوں، جعلی خبروں، ڈس انفارمیشن اور مصنوعی ذہانت سے تیار کی گئی ویڈیوز کا ایک طوفان برپا رہا، جس نے نہ صرف عوام میں افراتفری پھیلائی بلکہ امدادی کارروائیوں میں بھی رکاوٹیں پیدا کیں۔ ہمارے مشاہدے کے مطابق عام صارفین کے ساتھ ساتھ معروف انفلوئنسرز اور میڈیا اداروں کے آفیشل سوشل میڈیا اکاؤنٹس بھی اس عمل میں شریک نظر آئے، جن سے جھوٹی خبریں اور اے آئی پر مبنی ویڈیوز بڑے پیمانے پر شیئر کی گئیں۔ ٹی این این نے متعدد اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال اور فیکٹ چیکنگ کے بعد واضح کیا کہ ان میں سے زیادہ تر مواد جعلی اور گمراہ کن تھا۔

گزشتہ ہفتے ضلع بونیر میں آنے والے سیلاب کے دوران فیس بک اکاؤنٹ " ڈاکٹر محمد عفان قیصر" سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ ایک سکول میں موجود 150 بچے اور عمارت دونوں ہی سیلاب کی نذر ہوگئے ہیں۔ اسی طرح " پاک ٹرنرز ڈائری" پیج پر پوسٹ کیا گیا کہ ڈاکٹر سویرا پرکاش نے الخدمت فاؤنڈیشن بونیر کو 5 کروڑ روپے عطیہ کئے۔

تحقیقات سے دونوں دعوے جھوٹے ثابت ہوئے اور ڈاکٹر سویرا پرکاش نے ویڈیو بیان جاری کرکے خبر کی تردید بھی کی۔ اس کے علاوہ " عباس سنگین" نامی صارف کے اکاؤنٹ سے ایک پلازہ دکھانے والی ویڈیو شیئر کی گئی جسے پشاور صدر پلازہ کے سیلاب سے تباہ ہونے کے طور پر پیش کیا گیا۔ فیکٹ چیکنگ میں پتہ چلا کہ یہ ویڈیو دراصل سوات کے منگورہ بازار کی تھی۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ ایک انفوگرافکس کے ذریعے صحافی سلیم صافی کے نام سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ " خیبر پختونخوا کے 90 فیصد جنگلات کاٹنے کے ٹھیکے عمر ایوب، علی امین گنڈاپور اور جنید اکبر

گروپ کے پاس ہیں اور یہی سیلاب کے ذمہ دار ہیں۔" بعد ازاں تحقیق سے یہ خبر مکمل طور پر غلط ثابت ہوئی۔ سلیم صافی نے اپنے آفیشل " ایکس" اکاؤنٹ سے تردید کرتے ہوئے اسے فیک نیوز قرار دیا اور وضاحت کی کہ میرے نام سے پھیلائی جانے والی یہ جھوٹی خبریں عوام کو گمراہ کرتی ہیں۔

اسی دوران جعلی ویڈیوز بھی منظر عام پر آئیں۔ ایک فیس بک صارف " راشد محمود" نے چند سیکنڈ کی ایک ویڈیو پوسٹ کی، جس میں برساتی نالے کے قریب ایک بچہ جھاڑیوں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ کیپشن میں لکھا گیا کہ یہ " قدرت کا معجزہ ہے اور بچہ بونیر کے بشنوئی گاؤں میں سیلابی ریلے سے زندہ بچ گیا۔" ویڈیو میں بچے کے صاف ستھرے کپڑے اور محفوظ حالت نے شکوک پیدا کیے۔ انٹرنیٹ پر فیکٹ چیک کے بعد یہ ویڈیو مصنوعی ذہانت سے بنائی گئی ثابت ہوئی۔

مزید برآں، انٹرنیشنل میڈیا ادارے " دی نیشنل" کے آفیشل فیس بک پیج پر ایک ویڈیو اپلوڈ کی گئی، جس میں کلاوڈ برسٹ اور بونیر میں تباہ کن سیلاب دکھایا گیا۔ لاکھوں افراد نے اسے دیکھا لیکن مقامی صحافی اظہار اللہ نے اس فوٹیج کو اے آئی سے تیار کردہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوشل میڈیا پر جھوٹے مواد کا بازار تو گرم تھا ہی مگر افسوسناک طور پر ایک پاکستانی ٹی وی چینل نے بھی غیر مصدقہ ویڈیوز نشر کیں، جس سے عوام میں مزید الجھن پیدا ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ کئی حقیقی ویڈیوز بھی شیئر ہوئیں لیکن وہ دراصل پڑوسی ملک کے حالیہ سیلاب سے تعلق رکھتی تھیں، جنہیں خیبر پختونخوا کی تباہی سے جوڑ دیا گیا۔

امدادی کارروائیوں پر اس جعلی معلومات کے اثرات کے حوالے سے ریسکیو 1122 خیبر پختونخوا کے ترجمان بلال احد فیضی نے بتایا کہ کسی بڑے حادثے کے دوران ہمیں ہمیشہ فیک نیوز اور جعلی ویڈیوز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالیہ سوات، باجوڑ اور بونیر میں سیلاب کے دوران بھی غیر مصدقہ پیغامات نے خوف پھیلایا اور مقامی افراد کے ساتھ ساتھ ہماری ریسکیو سرگرمیوں کو بھی متاثر کیا۔

میڈیا میٹر فار ڈیموکریسی کے بانی اور سی ای او اسد بیگ نے اس صورتحال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی حادثے کے دوران جعلی خبریں اور ڈس انفارمیشن تیزی سے پھیلتی ہیں۔ مثال کے طور پر

خیبر پختونخوا میں سیلاب

جہاز گرنے کے بعد فوری طور پر فیک ویڈیوز اور آڈیوز سامنے آجاتے ہیں، جنہیں صارفین محض توجہ اور ویوز حاصل کرنے کے لیے شیئر کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہایت اہم ہے کہ این ڈی ایم اے اور پی ڈی ایم اے جیسے ادارے فوری طور پر عوام کو آگاہ

60 فی صد قصور حکومت کا تو 40 فی صد عوام کا بھی

کریں کہ جعلی معلومات گردش کر سکتی ہیں، لہٰذا صرف معتبر ذرائع پر بھروسہ کیا جائے۔

اسد بیگ نے کہا کہ آج کے دور میں ڈس انفارمیشن پھیلانا بہت آسان ہو گیا ہے، کیونکہ اے آئی اور ڈیپ فیک ٹولز کے ذریعے منٹوں میں جعلی ویڈیوز تیار ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا کہ بعض اوقات اصلی ویڈیوز کو بھی جھوٹا قرار دے دیا جاتا ہے، جس سے عوام کا اعتماد متزلزل ہوتا ہے اور نقصان بڑھ جاتا ہے۔ کئی مثالوں میں لوگ متاثرہ علاقوں کی ویڈیوز کو جعلی سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں اور پھر سفر کے دوران خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

انہوں نے تجویز دی کہ سرکاری اداروں کو واضح طور پر بتانا چاہیے کہ کون سے آفیشل ذرائع معتبر ہیں اور کن پر یقین نہیں کیا جانا چاہیے۔ کورونا وبا کے دوران یہی ماڈل کامیاب رہا، جسے اب دیگر ہنگامی حالات میں بھی اپنانا ضروری ہے۔

Murtaza Hadier ایک ایماندار رپورٹر سچ کو بیان کرتا ہے امید ہے آپکی وال سے کے پی کے کے بارے میں بھی سچ سامنے آئے گا بارش کا ہونا اللہ کی قدرت ہے زیادہ بارش زیادہ پانی اور ویسے بھی قدرت کے سامنے انسانی طاقت کچھ معنی نہیں اس میں گورنمنٹ کو وہ کسی کی بھی ہو گورنمنٹ ہو قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں انسان کو مزاق نہیں اڑانا چاہیے تنقید بھی وہاں اچھی لگتی ہے جہاں بلاامتیاز کی جائے پسند ناپسند والا معاملہ نا ہو۔

گورنمنٹ کا فرض اچھے وسائل فراہم کرنا ہے مشکل وقت میں مدد کرنا فرض ہے ایسے اقدام کرنا ہوتا ہے جس سے مشکلات میں مدد مل سکے۔

ہمارے علاقے میں کبھی کبھار کلاؤڈ برسٹ ہوتا رہا ہے

لیکن وہ اپنی انکھوں سے ہم نے جو دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی جگہ پر آسمانی بجلی گرتی ہے تو وہاں سے طوفان میں بھی رفتار سے ملبہ

پتھر پانی کیچڑ یہ چلنا شروع کر دیتا ہے اگر تو گہری کھائی موجود ہے تو وہ اسی میں سفر کرتا ہے بصورت دیگر اسے جس طرف راستہ ملتا ہے وہ اسی طرف جاتا ہے

لیکن یہ پچھلے چند سال سے بلکہ گزشتہ دو سال سے جتنی تیز رفتاری سے مقبوضہ کشمیر میں ازاد کشمیر میں خیبر پختون خواہ میں اور ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں جتنی تیز رفتاری سے کلاؤڈ برسٹ کی کے واقعات ہو رہے ہیں تو اس سے یہ بھی ایک شک پیدا ہو رہا ہے کہ یہ کسی سائنسی تجربے کے ذریعے تو نہیں ہو رہا کیونکہ اج کل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ بادلوں کو چارج یا ڈسچارج کیا جاتا ہے جیسا کہ

جنگلات کا بے دریغ کٹاؤ بند کیا جائے

چائنہ نے اولمپکس گیمز میں کیا تھا کہ وہاں ہونے والی برسات کے بادلوں کو ڈسچارج کر کے وہاں سے آگے نکال دیا تھا تو یہ بھی پاسیبل ہے کہ اتنا زیادہ ان کو چارج کر دیا جائے تو وہ کسی بھی جگہ آسمانی بجلی گرتی ہے اور اتنی زیادہ مقدار میں بادل اکٹھے ہو جاتے ہیں وہ ایک جگہ پر بہت زیادہ پانی بہہ نکلتا ہے ابھی تو کچھ بظاہر اس کے شواہد نہیں ہیں لیکن یہ بھی ایک ممکنہ وجہ ہو سکتی ہے۔

کلاؤڈ برسٹ اپنی جگہ مگر جب ہم ندی نالوں کی گزرگاہوں پر تعمیرات کر کے پانی کا راستہ بند کریں گے۔

پہاڑوں سے جنگلات کا صفایا کر کے سیلاب کے راستے سے رکاوٹیں ہٹا دیں گے۔

تو قدرت کسی کی دشمن نہیں آپ خود اپنے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

سیلابی ریلوں میں بہہ کر آنے والوں ہزاروں کٹے ہوئے درخت اور ندی نالوں کے بیڈ پر بنی تعمیرات اس قوم کی اخلاقی پستی اور لالچ کا نوحہ بیان کر رہے ہیں کہ ذمہ داران کی بدعنوانی اور ہماری لالچ اب ہمیں نگل رہی ہے۔ ❀

صدام ساگر دل سے لکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کے ذوق کا خیال رکھتے ہیں۔ اپنی تحریر کو موزوں اشعار سے سجاتے ہیں۔ سیلابی صورتِ حال پر ہماری گزارش پر بہت عمدہ تحریر سے نوازا ہے۔ اور کئی قیمتی تجاویز بھی دی ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

سرکاری ادارے ہمیشہ بعد میں جاگتے ہیں

تحریر: صدام ساگر

سیلاب پانی کا وہ بے قابو بہاؤ ہے جو دریاؤں کے کناروں سے باہر نکل کر آبادیوں، زرعی زمینوں اور املاک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کی تباہ کاریوں میں جانی نقصان، بڑے پیمانے پر بے گھر ہونا، بنیادی نقصانات شامل ہیں۔ جس سے خاص طور پر خواتین، بچے اور معمر افراد سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

گزشتہ دنوں میں ایسی ہی صورتحال سے ہمارا پاکستان بھی دوچار رہا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان سے چھوڑا گیا پانی اور حالیہ دنوں بارشوں کے سلسلے سے پاکستان ایک بڑے پیمانہ پر سیلاب کی زد میں ہے۔

وہ جو پیاسا لگتا تھا سیلاب زدہ تھا
پانی پانی کہتے کہتے ڈوب گیا ہے

چاروں طرف سے نہروں اور چھوٹی چھوٹی ندیوں نے گھیر رکھا ہے۔ جبکہ دریائے چناب اس سے کوسوں دور ہے۔ اس لیے سیلاب سے متاثر ہونے کے خدشات بہت کم ہوتے ہیں۔ آج سے چالیس سال قبل جب اسی طرح سیلاب آیا تو گوجرانوالہ کے بہت سے علاقے بھی پانی کی زد میں آ گئے تھے۔ جس کے بعد اس شہر کی سڑکوں اور گلیوں اور زمین سے بہت اونچا کیا گیا جبکہ نہروں اور ندیوں کی کھدائی کا کام بھی کیا گیا جس کے بعد آج تک اس شہر میں سیلابی ریلے نے کبھی رُخ نہیں کیا۔

گوجرانوالہ شہر میں جو لوگ دیہاتی علاقوں میں موجود ہیں وہ کچھ حد تک ضرور متاثر ہوتے ہیں جب دریا کا پانی نہروں اور ندیوں میں چھوڑا جاتا ہے لیکن اُس سے نقصانات کے خدشات بہت کم ہوتے ہیں۔ موجودہ صورتحال کے مطابق دریائے چناب کے قریب بہت سے گاؤں اُجڑ گئے، بہت سے کسانوں کے فصلیں اور مویشی پانی میں بہہ گئے۔

گوجرانوالہ، گجرات، وزیر آباد جیسے شہروں کو بچانے کے لیے اس بار دریا کے بند تک توڑ دیئے گئے تاکہ شہروں کو محفوظ رکھا جائیں، لیکن کچھ شہر مسلسل بارشوں کی وجہ سے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ سیلابی ریلے سے قبل کسی بھی شہر یا گاؤں میں کوئی خبر موصول نہیں ہوتی۔ ایسی صورتحال میں خبر ہو بھی جائے تو شہروں اور گاؤں کے لوگ اپنے گھروں اور سامان کو بچانے میں مصروف ہوتے ہیں لیکن سرکاری ادارے ہمیشہ کی طرح بعد میں جاگتے ہیں بقول انور مسعود کہ:

رفتار ہے سیلاب کی آندھی کی طرح تیز
دریا ہیں کہ دھرتی کہ طرف دوڑ پڑے ہیں
آہستہ و کم کم ہے مگر وقت کی رفتار
راتیں بھی مصیبت کی بڑی دن بھی بڑے ہیں

سورۂ یوسف ہمیں بتاتی ہے کہ ہم بہترین منصوبہ بندی سے قدرتی آفات سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔ یہ سیلاب کی آفت تو چند دن کی آفت ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ سلام کے دور میں غذائی قلت کی پیدا ہونے والی آفت سات سالہ تھی، لیکن کمال حکمت اور تدبیر سے ایسے اقدامات کیے گئے کہ سات سالہ طویل مدتی آفت کو شکست دے دی گئی، یہ صرف ایک مثال دی ہے کہ ہم بہترین منصوبہ بندی اور حکمت سے قدرتی آفات کو بھی شکست دے سکتے ہیں اور قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے، ہماری حکومتوں کو پتا ہوتا ہے کہ خطے کی موسمی صورتحال کے مطابق ہر سال مون سون میں ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے لیے کبھی مؤثر اقدامات نہیں کیے گئے جن میں سب سے مؤثر اقدام ڈیمز ہی ہیں، لیکن عالمی اداروں کی سازش سے ایسا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس مضمون کے دوران ممتاز دانشور، تجزیہ کار ادریس ناز بتاتے ہیں کہ:

”قوم ہر سال ان قدرتی آفات کی وجہ سے مزید تباہ و برباد ہوتی ہے، ہمارے حکمرانوں کو یہ تباہی بھی فائدہ دیتی ہے، تباہی کے نام پر امداد کی صورت میں عالمی سامراجی طاقتیں پھر اربوں ڈالر بطور امداد دیتی ہیں جو بالواسطہ اور بلاواسطہ پھر ان حکمرانوں کے خزانوں میں چلا جاتا ہے، یہ قدرتی آفات بھی ہمارے حکمرانوں کی ”آمدن“ کا ایک ذریعہ ہیں، لہٰذا ان سے نمٹنے کی تدابیر کر کے وہ مستقل طور پر اپنی ”آمدن“ بند نہیں کرنا چاہتے لہٰذا ہر سال قدرتی آفات آتی ہیں، قوم اپنے سینے پر ان آفات کو جھیلتے ہیں اور حکمران کشتیوں میں سلفیاں لے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قوم کا درد ان کو چین نہیں لینے دے رہا لیکن درحقیقت وہ یہ ویڈیوز اور تصاویر عالمی سامراج سے زیادہ سے زیادہ امداد لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“

موسمیاتی تبدیلیوں کے ممکنہ خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے کچھ لوگ اپنی صوبائی حکومت کے اقدامات سے مطمئن ہیں بھی اور کچھ لوگ نہیں بھی۔ جن شہروں میں سیلاب نہیں آیا اُن لوگوں کو صوبائی حکومت سے کیا لینا دینا البتہ جن شہروں اور دیہاتوں میں سیلاب سے ضرورت سے زیادہ نقصان ہوا ہے وہاں کے لوگ اپنی صوبائی حکومتوں سے بہت نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے گھر پانی میں بہہ گئے کیا ہمارے حکمران لوٹا پائیں گے؟ جن کے جوان بیٹے اور بیٹیاں موت کے منہ میں جا گرے کیا ہمارے حکمران لوٹا پائیں گے؟ بے زباں جو مویشی پانی کی نذر ہو گئے کیا حکمران ان مویشیوں کو واپس لا پائیں گے؟

اس سیلاب کی آفت سے جہاں بہت سے لوگ متاثر ہوئے وہیں اُن

میں کچھ ہمارے بھی عزیز واقارب بھی شامل تھے۔ جی ہاں شہر لاہور میں دریائے روای میں سیلابی ریلے کی وجہ سے دیگر شہروں کی طرح

جن کے گھر پانی میں بہہ گئے کیا ہمارے حکمران لوٹا پائیں گے

مین شہر تو محفوظ رہا لیکن بہت سی دیہاتی بستیاں زیرِ آب آنے کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئیں۔ جس سے بہت سے لوگوں بھاری نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ لاہور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں میری چھوٹی ہمشیرہ کی فصلیں بھی متاثر ہوئی۔ ان کے گاؤں سے دریائے روای بہت دور ہے لیکن ایک نہر ان کے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے جس میں ضرورت سے زیادہ سیلاب کا پانی آنے کی وجہ سے کھیت کچھ حد تک متاثر ہوئے۔ ان کے گاؤں میں آج بھی سبھی مٹی کے کچے مکان موجود ہیں جو مسلسل بارشوں اور ہواؤں کے چلنے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے رہتے ہیں۔

سیلاب کے دنوں میں کچھ لوگوں نے ضرورت سے زیادہ نفع بھی کمایا جس کی مثال ہمارے اخبارات اور ٹی وی چینلز ہیں جو سیلاب میں پھنسے ہوئے لوگوں کی بے بسی اور مصیبت کی گھڑی میں اُن کا دکھ بانٹنے کی بجائے ہمارے حکمرانوں کی سلفیاں اور کشتیوں میں بیٹھنے ، جہازوں میں سفر کرنے اور اُن کے مختلف شہروں اور دیہاتی علاقوں میں پروٹوکول دکھانے میں مگن رہے۔ وہیں اخبارات میں سیلاب کی

اخبارات کو اشتہارات کے ذریعے لاکھوں روپے کے مفادات پورے کیے گئے

زد میں آنے والے لوگوں کی مدد کے لیے سرکاری اشتہارات کا سلسلہ جاری وساری رہا جس سے اخبارات کے مالکان کو لاکھوں روپے کے فائدے پہنچائے گئے۔ آفت کے اس موقع پر ہمارے ساتھ سوشل میڈیا اور لوکل اخبارات کے لوگ کھڑے تھے جنہوں نے سیلاب کی

دریاؤں کے پاٹ صاف کریں۔ مزید نہریں نکالیں

زد میں آئے ہوئے لوگوں کی بروقت خبر عوام تک پہنچانے میں مدد کی۔ سوشل میڈیا پر پانی میں پھنسی ہوئی خواتین کے ساتھ کچھ لوگوں نے اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا کچھ لوگ آج بھی پانی میں گزر بسر کرتے ہوئے دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہے ہیں۔

سیلاب جیسی آفت میں سوشل میڈیا فیس بک ، یوٹیوب کا کردار میں اوپر بتا چکا ہوں کہ کچھ حد تک اچھا رہا۔ ہاں فیس بک اور یوٹیوب پر کچھ لوگ اپنے فالورز بڑھانے کے چکر میں ہونٹ بٹانگ حرکتیں کرتے نظر آئے لیکن اُس سے اُن کا اپنا ہی امیج خراب ہوا ہوگا۔ کسی دوسرے کو کوئی نقصان تھوڑی ہوا ہوگا۔

جہاں تک بھارت کی ابی جارحیت کی بات ہے تو بھارت اس سے پہلے بھی کئی بات اپنی گٹھیا سوچ کا استعمال کر چکا ہے۔ میرے خیال میں جب تک پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود ہیں بھارت اس طرح کی زنگ آلودہ سوچوں کا استعمال کرتا رہے گا۔ کیوں کہ ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان نے کبھی بھی محبت کی فصلیں اُگانے اور امن کی فضا کو خوشگوار بنانے میں اپنا ردِ عمل اختیار نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اس ارضِ پاک کو میلی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اختلافات کو نئی سے نئی ہوا دی ہے جس سے دلوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگنے لگی ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کا قصور یہ ہے کہ کئی برس بیت جانے کے باوجود بھی ہم سیلاب جیسی آفت سے پوری طرح نمٹنے میں ناکام رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ سیلاب جیسی تباہی سے ہمیشہ کی طرح نہ پہلے کسی کو کوئی فرق پڑا اور نہ ہی آئیندہ کسی کو رتی برابر فرق پڑے گا۔ تب بھی یہی لوگ حکمران تھے اور آج بھی یہی لوگ حکمران ہیں، تب بھی عالمی طاقتوں کا ایجنڈا پاکستان کی تباہی تھا اور آج بھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستانی عوام چالیس سال پہلے بھی اتنی ہی لاعلم تھی، نہ تب شعور تھا نہ آج شعور ہے، ہم تب بھی یہی سمجھتے تھے کہ قدرتی آفات سے نمٹنے کا کوئی حل نہیں۔ آج بھی یہی سمجھتے ہیں۔

اب کچھ بات دریاؤں کے حوالے سے ہو جائے پاکستان کے دو دریا ایسے ہیں جنہیں ہم نے ہمیشہ ہی خشک دیکھا ہے۔ لیکن اس بار بھارت سے چھوڑے گئے پانی سے دیگر دریاؤں کی طرح ان دونوں دریاؤں میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی دیکھنے کا ملا۔ جس سے دریاؤں کے کناروں پر سکونت پذیر لوگوں کی رہائشیں اور فصلیں پانی میں بہہ گئی۔ میرے خیال میں پاکستان کو ممکنہ آبی بھارتی جارحیت سے نمٹنے کے لیے ان دریاؤں کے پاٹوں کی کھدائی کروانے اور مزید نئی نہریں نکالنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ تاکہ ہم آنے والی ایسی تمام آبی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے وقت سے پہلے منصوبہ بندی کر سکیں۔ رہی بات بھارت کی آبی جارحیت کے خلاف پاکستان کو عالمی اداروں کا در کھٹکھٹانے کی تو اس حوالے سے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر عالمی اداروں سے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے ایسے ہتھ کنڈے استعمال کیے جاتے ہیں جو آفت زدہ مصیبت کی طرح لگے۔ ان حکمرانوں کو کیا پتا خدا کی طرف سے جب آفت کوئی بھی آتی ہے تو پھر کچھ بھی محفوظ نہیں رہتا سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے آج کے حکمرانوں اور لوگوں کے لیے ''طوفانِ نوحؑ'' کا سچا قصہ ہی کافی ہوگا۔ نہیں تو ادریس ناز کا یہ خیال سُن لیں:۔

اے نوح! التماس ہے، کشتی نکالیے
طوفاں تُلا ہُوا ہے مٹانے کو زندگی

"خبر تو جا ہی چکی تھی اداریہ بھی گیا"
ایک الوداعیہ نوحہ

خبر تو جا ہی چکی تھی اداریہ بھی گیا
مزاج عصر پرکھنے کا زاویہ بھی گیا
نظر یات سیاست سے ہو چکے خارج
اسی ڈگر پہ چلو آج میڈیا بھی گیا
کہاں کے لوح و قلم اب ہے دور کی پیڈاں
صریر خامہ گئی حرف خوش نما بھی گیا
نہ فکر امن جہاں ہے نہ اب سحر خیزی
مدیر گوشہ نشیں کا مراقبہ بھی گیا
عوام جاننا چاہیں گے صبح دم لیکن
وہ سادہ سادہ سے لفظوں میں عندیہ بھی گیا
رہیں گے اپنی غلط فہمیوں کی جنت میں
ضمیر چارہ گراں کا وہ چونکنا بھی گیا
یہی ورق تو گزرتا تھا حاکموں پہ گراں
ہر ایک صبح جو ملتا تھا ولولہ بھی گیا

محمود شام

رانا محمد شاہد۔اطراف کے قلمی معاون ہیں۔ ہمیشہ بہت اہم تحریروں سے نوازتے ہیں۔حالیہ سیلابی صورت حال کے لیے ان سے درخواست کی گئی تو انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں ایک مضمون عنایت کیا ہے۔بہت سی قیمتی تجاویز بھی ہیں۔پڑھیئے اور اپنی رائے دیجئے۔اطراف کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اپنے قارئین کو ہر شہر کے حالات سے آگاہ کیا جائے۔

کھادر نہر نے ہمارے شہر کو بچا لیا

تحریر: رانا محمد شاہد، بورے والا

الحمدللہ ہمارا شہر بورے والا سیلابی صورتحال سے محفوظ ہے۔اس کی ایک وجہ کھادر نہر ہے۔جس نے پانی شہر کی طرف نہیں آنے دیا۔البتہ شہر کے مضافاتی علاقے ساہوکا وغیرہ شدید متاثر ہوئے۔ویسے بھی مجموعی طور پر شہروں سے زیادہ دیہاتی علاقے حالیہ سیلاب کی زد میں آئے۔

ان کی رہائش لاہور میں دریائے راوی کے کنارے موجود سکیم میں تھی۔

کہتے ہیں کہ دریا کے راستے میں گھر بنائیں گے تو کبھی نہ کبھی دریا اپنا گھر،اپنی جگہ واپس لے گا۔

یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ خصوصاً دریائے راوی، دریائے ستلج جو کئی برس سے خشک ہو چکے ہیں۔ان کے ملحقہ علاقوں یا پاٹوں پر آبادی یا رہائشی سکیم نہ بننے دے۔تاکہ عوام کو بعد کے بڑے نقصانات سے بچایا جاسکے۔

بھارت کی آبی جارحیت کے خلاف پاکستان کو عالمی اداروں کا دروازہ کھٹکھٹانے کا پہلے کوئی فائدہ ہوا ہے،جو اب ایسا ہوگا۔پاکستان کو دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے ایسے اقدامات کرنے چاہئیں۔جن سے عوام کے نقصانات کو کم کیا جاسکے۔

وہاڑی کی ایک طالبہ حمنا، جو میری کتاب پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ان سے اس حوالے سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہاڑی میں بھی صورتحال کنٹرول میں ہے۔تاہم سیالکوٹ میں موجود ان کے رشتے دار ضرور متاثر ہوئے ہیں۔کیونکہ سیالکوٹ اور وزیر آباد کے حالات خاصے مخدوش ہیں۔

حکومت پاکستان کی متعلقہ تیاریوں کے حوالے سے تو یہی کہیں گے کہ یہ ایک فلمی سکرپٹ کی طرح ہو چکا ہے۔سیلاب سے پندرہ،بیس

دن پہلے محکمہ موسمیات کی طرف سے ممکنہ سیلاب کی پیش گوئی کی جاتی ہے۔اس کے چند روز بعد اخبارات میں اشتہارات کی صورت بتایا جاتا ہے کہ سیلاب آنے کی صورت میں عوام کو کیا کرنا ہے (یعنی

حکومت کی تیاریاں ایک فلمی اسکرپٹ کی طرح

سکرپٹ کے مطابق بھی عوام نے ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہے)۔پھر کچھ روز بعد شدید بارشوں کی اطلاع دی جاتی ہے۔پھر اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے عوام کو بتایا جاتا ہے کہ حکومت نے کثیر رقم خرچ کر کے فلاں فلاں دریا اور ندی نالوں کے پشتے مضبوط بنا دیئے ہیں۔اس کے بعد کوئی حکومتی وزیر یا مجاز افسر دریا کنارے حالات کا جائزہ لینے جاتا ہے اور سب اچھا کی رپورٹ دی جاتی ہے۔ابھی سب اچھا کی بازگشت ختم نہیں ہوتی کہ پہلی بارش سے ہی شہر کی سڑکیں،گلیاں تالاب کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔پانی نکالنے کی خوشخبری سنائی جاتی ہے اور نکال بھی دیا جاتا ہے۔خبر چلتی ہے کہ ریکارڈ ٹائم میں پانی نکال دیا گیا ہے۔مگر جب آپ گراؤنڈ میں جاتے ہیں تو حقیقت سامنے آتی ہے کہ جوں کا توں کھڑا ہے اور خود ہی آہستہ آہستہ اپنی مرضی سے نکل رہا ہے۔

بارشوں کے باعث سیلاب کے خطرے کی خبر دی جاتی ہے اور ساتھ ہی بتا دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں بند ٹوٹ گئے ہیں۔(یعنی جو بند کچھ ہفتے پہلے کثیر رقم سے بنائے گئے تھے،وہ ٹوٹ گئے ہیں)۔پھر سیلاب دیہاتوں اور شہروں کا رخ کرتا ہے۔اس کے بعد کشتیاں، خیمے، کھانے پینے کے ڈھابے وغیرہ دکھا کر بتایا جاتا ہے کہ سیلاب سے نمٹنے کے تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں اور یہ کہ مشکل کی اس گھڑی میں عوام کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔پھر خبر آجاتی ہے کہ بھارت نے پانی چھوڑ دیا ہے۔اور پھر

الحمدللہ بوریوالہ محفوظ رہا

سیلاب۔۔۔۔۔۔سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔حکومت کے تمام اقدامات کسی فلمی سکرپٹ کی طرح ہی محسوس ہوتے ہیں۔

گزشتہ ہفتے ایک ایم ایس سی کی طالبہ ام کلثوم نے واٹس ایپ کے ذریعے پوچھا کہ" سرڈونیشن ہوسکتا ہے۔آپ یا آپ کے جاننے والے سے،سیلاب متاثرین کے لیے۔ضرورت ہے انہیں"۔میں نے انہیں بتایا کہ سردست تو میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔تاہم میرے کئی جاننے والے ہیں۔ان سے بات کرکے آپ کو بتاتا ہوں۔ان سے بات ہوئی تو وہ کہنے لگے۔

" متاثرین جن علاقوں میں پھنسے ہوئے ہیں یا قریبی سکولز یا سرکاری اداروں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔وہاں حکومت ان کی مدد کر رہی ہے۔شہر کے سیاستدان بھی اپنے اپنے حلقے میں جا رہے ہیں۔جس کی ویڈیوز موجود ہیں۔اخوت اور دیگر فلاحی ادارے بھی لوگوں کی مدد کر رہے ہیں"۔ان باتوں کے بعد میں خاموش ہوگیا۔اس لیے کہ ان باتوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ کو معلومات فراہم کردیں، یہی ہماری طرف سے مدد تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ میرے دو، چار جاننے والے مخیر حضرات کا ہی نہیں، مجموعی طور پر سب پاکستانیوں کا ہے۔ہم خود کچھ کرنے کی بجائے سیلاب، زلزلے اور ہر آفت میں عالمی اداروں کی امداد اور دوست ممالک کی نظر کرم کے منتظر رہتے ہیں اور انفرادی طور پر بھی دوسروں کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔ اس ملک کے تمام دولت مند سرمایہ دار، کاروباری حضرات، فنکار، کھلاڑی، گلوکار اور سیاستدان ۔۔۔۔ بیانات کی حد تک تو سامنے آتے ہیں۔لیکن عملی طور پر جیب سے ٹکا خرچ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔آپ کے سامنے کوئی خبر آئی ہو کہ کسی کھرب پتی صنعتکار یا ارب پتی سرمایہ دار نے، لاکھوں، کروڑوں معاوضہ لینے والے کسی اداکار، گلوکار نے اپنے پلے سے ایسی آفت میں کسی کی مدد کی ہو۔اس وقت یہ افسوس بڑھ جاتا ہے، جب ہم ہمسایہ ملک میں صورتحال اس کے برعکس دیکھتے ہیں۔

بھارتی اداکاروں نے سیلاب زدگان کی دل کھول کر مدد کی

ہمارے اداکار، گلوکار، صنت کار صرف بیانات دیتے رہے

ہمسایہ ملک بھارت میں بھی تباہی ویسی ہی ہے، جیسی یہاں ہے۔مگر وہاں کے سرمایہ دار، صنعتکار، فنکار، گلوکار امدادی کاموں میں اپنی جیب سے حصہ لیتے دکھائی دیتے ہیں۔معروف بھارتی سپر اسٹار راجیش کھنہ کے داماد نامور اداکار اکشے کمار نے پانچ کروڑ روپے (جو پاکستانی روپوں میں سولہ کروڑ سے زیادہ بنتے ہیں) کرکٹ فرنچائز ٹیم پنجاب کنگز نے دو کروڑ روپے، اداکار سلمان خان اور دیگر معروف گلوکاروں نے اپنی جیب سے سیکنڑوں کشتیاں اور ایمبولینس فراہم کیں۔یہ ہوتا ہے جذبہ، جو ہمارے ہاں نظر نہیں آیا۔ ۞

ڈاکٹر فیاض احمد شیخ دنیا میں ایک مسلمہ ماہر سر درد ہیں۔ سر درد کے معالجین کی ایسوسی ایشن کے چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔ فضلی سنز سے ان کی خود نوشت ''تہ گرد'' شائع ہو کر مقبولیت خاص و عام پا چکی ہے۔ ان سے گزارش کی گئی کہ وہ سر درد کے علاج کے سلسلے میں اطراف میں سلسلے وار تحریروں سے نوازیں۔ ان کی پہلی تحریر ملاحظہ کریں۔

میں نے سر درد کا خصوصی انتخاب کیوں کیا؟

تحریر: ڈاکٹر فیاض شیخ (برطانیہ)

خطرے والی وجوہات سر درد ایک بہت عام علامت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے کبھی سر درد نہ ہوا ہو۔ تحقیق کے مطابق ایسے لوگوں کی شرح ۲۔۳ فیصد ہے جنہیں کبھی سر درد نہیں ہوا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک نیورولوجسٹ کا کام سر درد کے مریضوں کی وجہ سے چلتا ہے۔ شاید اسی لیے نیورولوجی کی تربیت کے دوران میں نے سر درد کا خصوصی انتخاب کیا۔ بیشتر لوگوں میں سر درد کی وجہ کوئی خطرناک بیماری نہیں ہوتی۔ ۱۰۰ میں سے شاید ایک فیصد یا اس سے بھی کم لوگوں میں کوئی بڑی بیماری ہوتی ہے۔ اکثریت کو یا تو پٹھوں کے کھچاؤ جسے ٹینشن سر درد کہتے ہیں یا درد شقیقہ یعنی مائیگرین ہی اس کی وجہ ہوتی ہے۔ اسے اکثر آدھے سر کا درد بھی کہتے ہیں گو کہ کئی لوگوں میں یہ دونوں طرف بھی ہو سکتا ہے۔ مریضوں کی

اکثریت میں یہ دونوں معمولی شدت کا درد کرتے ہیں مگر بہت عام ہونے کی وجہ سے پھر بھی کروڑوں لوگ ایسے ہیں جن میں اس درد کی وجہ سے ان کے معمولات زندگی بہت بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو آپ کو کرنی چاہئے اگر آپ کو باقاعدہ سر درد رہے کہ آپ اپنی آنکھیں چیک کرائیں، دیکھیں کہ آپ کو سائی نس کی تکلیف تو نہیں، آپ کو گردن میں پٹھوں کا کھچاؤ تو نہیں ہو رہا، آپ کے دانت تو صحت مند ہیں اور جبڑوں میں آرتھرائٹس تو نہیں۔ اکثر ہم ان عام چیزوں پر دھیان نہیں دیتے۔ سب سے پہلے میں آپ کو ان خطرناک وجوہ سے آگاہی دے دوں جس سے سب ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے سر درد کی وجہ یہ نہ ہو۔ آپ کو حیرانگی ہوگی کہ برین کا ٹیومر جس کا ہر شخص سب سے زیادہ سوچتا ہے شاید ہی کبھی سر درد کرتا ہو۔ برین ٹیومر کے مریض عموماً بیہوشی، بگڑتی ہوئی نظر، بولنے میں دقت

اور چہرے ہاتھ یا پیر میں کمزوری کی شکایت سب سے پہلے کرتے ہیں۔ سر درد تو بہت بعد میں ہوتا ہے جب ٹیومر کافی بڑا ہو چکا ہو۔ لہذا کبھی بھی اس کے بارے میں نہ سوچا کریں۔ دوسری چیز جو لوگوں کے ذہن پر سوار ہوتی ہے وہ برین ہیمورج ہے یعنی کسی شریان کے پھٹنے کی وجہ سے دماغ میں خون جمع ہونا۔ اگر آپ کے سر میں اچانک

سر درد۔ 98 فی صد کو ہوتا ہے

اور شدید درد ہو جیسے کسی نے کرکٹ کا بلا سر میں مار دیا ہو اور وہ کم از کم ایک سے پانچ منٹ رہے تو صرف اسی صورت میں یہ چیز ممکنہ ہے اور آپ کو فوری ایمرجینسی میں جانا چاہئے تا کہ اس کی تشخیص اور علاج ہو

تقریب رونمائی۔ کتاب تہ گرد

بمقام آراگ آڈیٹوریم۔ ڈاؤ میڈیکل کالج۔ کراچی

کرسی صدارت۔ ڈاکٹر ندیم ظفر

مہمان خصوصی۔ جناب محمود شام صاحب

اظہار خیال۔ ڈاکٹر عبد الباری

ڈاکٹر ثمرینہ ہاشمی

ڈاکٹر عرفان صبح

۲۷ ستمبر ۲۰۲۵ شام چھ بجے

۲۷ ستمبر اور اس سے قبل فروخت کی رقم انڈس ہسپتال کو عطیہ کی جائیگی

برین ٹیومر سر درد نہیں کرتا

سکے۔ اکثر اس قسم کا درد لوگوں کو ہوتا ہے مگر وہ چند سیکنڈ رہتا ہے۔ یہ آئس پک سر درد کہلاتا ہے اور قطعی خطرناک نہیں ہوتا لہٰذا اسے نظر انداز کر دیں۔

سر درد ہو تو سب سے سب سے پہلے کیا کریں

تیسری چیز جیسے مینن جائٹس یا گردن توڑ بخار بھی کہتے ہیں دماغ کی جھلیوں کی سوزش کا دوسرا نام ہے۔ اس میں سر درد کے ساتھ آپ کی گردن میں اکڑ پن محسوس ہوگا اور ساتھ ساتھ آپ کو تیز بخار یا جلد میں خارش یا داغ بھی نظر آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی آپ کو ایمرجینسی جانا چاہیے کیوں کہ آپ کو فوراً اینٹی بائیوٹکس کی ضرورت ہوگی۔ اگر فوراً علاج نہ شروع کریں تو کبھی کبھی انفیکشن برین کو بھی ہو سکتا جسے ہم این کیفلائیٹس کہتے ہیں۔ چوتھی خطرناک چیز سر اور دماغ کی شریانوں کی سوزش ہے جسے ٹیمپورل آرٹرائیٹس کہا جاتا ہے۔ عموماً ساٹھ سال سے بڑے لوگوں میں ہوتا ہے جس کی علامتوں میں وزن کم ہونا بھوک نہ لگنا تھکاوٹ رات کو پسینہ آنا نیند

نہ آنا بخار اور فلو کی کیفیات ہوتی ہیں جو کچھ ہی دنوں یا ہفتوں میں شروع ہوئی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کندھوں اور کولہوں کے پٹھوں میں درد بھی ہوتا ہے۔ خون کے ٹیسٹ سے اکثر اس کی تشخیص کر لی جاتی ہے اور اسٹیرائڈ اس کا علاج ہے جو فوراً شروع ہو جائے تو کوئی پیچیدگی کا خطرہ نہیں رہتا اور نہ فالج اور بینائی جانے کا خدشہ ہوتا

ہفتے میں Pain Killer دو دن سے زیادہ نہ لیں

ہے۔ اگر آپ کو کبھی زیادہ سر درد نہ ہوا ہو تو کچھ ہی دن قبل شروع ہونے والا سر درد ہو جو آہستہ آہستہ بڑھتا رہے فکر کا باعث ہے۔ اس کے لیے آپ کو اپنے معالج سے ضرور رابطہ کرنا چاہیئے کہ وہ آپ کا معائنہ کر کے سنجیدہ وجوہ کا خارج الامکان کر دے۔

ایک دو اور وجوہات جن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے ان میں دماغ کی وریدوں میں خون کا جمنا اور دماغ میں پانی کے پریشر کی زیادتی ہے۔ یہ خواتین میں زیادہ عام ہے خاص طور پر ان میں جن کا وزن بہت زیادہ ہو اور جو حمل روکنے کی ادویات لے رہی ہوں یا حاملہ یا

حمل کے بعد ہوں۔ اکثر آنکھوں کے پیچھے کا معائنہ کر کے مرض کی تشخیص ہو سکتی ہے۔ سر درد ہونے کی کچھ مزید خطرے کی علامات

فوراً علاج شروع ہو جائے تو پیچیدگی کا خطرہ نہیں ہوتا

میں مندرجہ ذیل چیزوں کو ذہن میں رکھیں کہ اس صورت میں معالج سے رجوع کرنا چاہیئے ۱۔ اگر آپ کا سر درد صرف کھانستے اور چھینکتے وقت ہوتا ہو ۲۔ اگر آپ کا سر درد صرف لیٹنے یا کھڑے ہونے سے ہوتا ہو ۳۔ اگر آپ کو پہلے کینسر ہو چکا ہو ۴۔ اگر آپ قوت مدافعت کو متاثر کرنے والی ادویات کا استعمال کر رہے ہوں جیسے اسٹیرائڈ۔ آخیر میں اگر آپ سر درد کے لیے پین کلر کا استعمال بہت زیادہ کریں یعنی مہینہ میں دس اور پندرہ دنوں سے زیادہ تو یہی پین کلر بھی آپ کے سر درد کا باعث بن سکتی ہیں۔ کوشش کریں کہ ہفتہ میں دو دن سے زیادہ پین کلر نہ لیں اور اگر آپ باقائدہ کئی ہفتوں سے اس مقدار سے زائد لے رہیں تو معالج سے رابطہ کریں۔ اگلی قسط میں آپ کو مائیگرین سے ہونے والے سر درد کی تفصیل اور اس کا علاج بتائینگے۔ ❀

"کتاب اور اطراف ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ پہلے شمارے سے ہی کتابوں کا تذکرہ آغاز ہوگیا تھا۔ خان ظفر افغانی کتابوں کے سنجیدہ قاری ہیں۔ اہم کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ خودنوشت سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ذاتی لائبریری میں ادب، تنقید، فلسفہ، خودنوشت، تاریخ، ترقی پسند مصنفین کی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے دینی کتابوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اطراف کے قارئین کو کتاب کے مندرجات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا جائے کہ یہ کتاب کیسے اور کہاں دستیاب ہے۔ پڑھیئے اور اپنی پسند کی کتابیں خرید کر پڑھیئے۔"

قرآن اور انسان: از ڈاکٹر محمد رب نواز خانزادہ

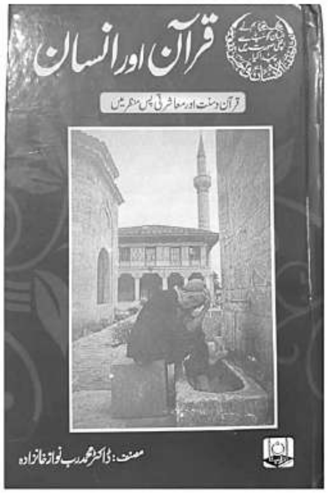

خان ظفر افغانی

زیرتذکرہ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد رب نواز خانزادہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا اس کتاب کو تحریر کرنے کا واحد اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ میں قرآن اور انسان کے دائمی رشتے کو اس قدر بیان کرسکوں جس قدر مجھے اپنی 66 سالہ زندگی کے بعد احساس ہوا ہے۔ جب میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور تاکید کے مطابق غوروفکر کرتا ہوں اور اپنے ملک کے حالات وواقعات پر اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے حالات پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اور میرا ملک صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے۔ ہمارے علم اور عمل میں فرق ہے۔ میں اور میرے ملک کے اکثر لوگ آنکھیں بند کرکے محض ثواب کے لیے قرآن پاک کو بغیر سمجھے پڑھتے پڑھتے اپنی پوری زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ یہ ایک مکمل اور حتمی حقیقت ہے کہ دنیا کے جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں انھوں نے قرآن پاک کے حکامات اور قوانین کو بلاواسطہ یا لواسطہ اپنے قوانین کا حصہ بنایا ہے۔ افسوس کہ ابھی تک حکومتِ پاکستان کوئی ایسا ادارہ قائم نہیں کرسکی جو قرآن پاک پر تحقیق کرنے کے بعد ایسی آیات، احکامات اور قوانین کو تلاش کرکے اپنے نظام کا حصہ بنا سکتی جس کی بنیاد پر پاکستان بھی ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہوتا اور ترقی یافتہ ممالک کا محتاج نہ ہوتا۔ ربِ کریم ہمیں قرآن حکیم میں درج انسان کے حقوق وفرائض پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے سرفراز فرمائے۔ 240 صفحات پہ مشتمل اس کتاب میں مصنف نے قرآن کی حُسن کاری اور تخلیق کاری شیرینی اور سحر آفرینی، مقام ربوبیت اور حُسن عبودیت، قرآن کریم کی تخلیقی خصوصیات، مقام انسان، حیاتِ انسانی، سفر زندگی کے راز اور دیگر عنوانات سے قرآن مجید کی آیاتِ مقدسہ کا بیان کرتے ہوئے اللہ کی وحدانیت، قرآن کی صفات، اس کی حکمت، قرآن اور انسان کے درمیان تعلق اور دیگر نکات کا جائزہ لیا ہے۔

مصنف نے اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہے ساتھ ہی وہ ہومیوپیتھک کے سند یافتہ ہیں۔ کئی فلاحی اداروں سے وابستہ ہیں اور فلاح وبہبود کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کتاب کو"ادبستان" (پاک ٹاور، سلطانی محلہ ،کبیر اسٹریٹ اردو بازار، لاہور) نے شائع کیا ہے۔ قیمت ہے سات سو روپے۔

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وفا" شارح، ڈاکٹر عابد شیروانی ایڈوکیٹ

اس کتاب میں علامہ محمد اقبال کی دو مشہور نظموں "شکوہ" اور جوابِ شکوہ" کا تقابلی مطالعہ ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ دو نظمیں آج بھی اتنی ہی اہم اور معروف ہیں۔ جتنی اُن کے دور میں مقبول عام تھیں۔ اس لیے یہی دو نظمیں اکثر لوگوں کے لیے اقبال سے ابتدائی تعارف کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اقبال کے کلام میں سب سے زیادہ تشریحات اِنھیں دو نظموں کی لکھی جا چکی ہیں۔

اس کتاب میں "شکوہ" کے تمام بندوں کو علی الترتیب رکھ کر اور بند کے مضمون کو مدِنظر رکھتے ہوئے "جوابِ شکوہ" کے متعلقہ مضمون کے بند کے ساتھ ہی ساتھ تشریح کی گئی ہے۔ اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں تجزیہ اور تقابلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح دونوں نظموں کے مضامین بیک وقت قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور جو الجھن الگ الگ پڑھنے میں درپیش ہوتی ہے اس اندازِ شرح سے اِس مخمصے کا ازالہ ممکن ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر عابد شیروانی ایڈوکیٹ ہیں اور شعر وادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ کئی معروف ادبی اداروں وتنظیموں کے سرپرست، بانی منتظم اور رُکن ہیں۔ زیرہ تذکرہ کتاب میں ڈاکٹر معین الدین عقیل محمود شام، مسلم شمیم، پروفیسر خیال آفاقی، پروفیسر ڈاکٹر رئیس صمدانی، افضل رضوی اور رانا خالد محمود قیصر کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں۔

علامہ اقبال اسٹوڈیو (اے, 108 بلاک ،2 گلستانِ جوہر، کراچی) کے زیر اہتمام اس کتاب کو ''الناشر پریس، نے شائع کیا ہے۔ 384 صفحات کی اس کتاب کی قیمت ہے ہزار روپے۔

''جستجو غور و فکر عبادت ہے'' از جسٹس سیّد افضل حیدر

جسٹس سیّد افضل حیدر کی زیر تذکرہ کتاب قرآن فہمی کے حوالے سے ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ''راقم آج سے چھ دہائیاں قبل قرآن پاک سے شعوری طور پر متعارف ہوا تھا ۔میرے استاد اللہ داد صاحب اور اباجی کی ہدایت تھی کہ قرآن کا ناظرہ پڑھنا اگرچہ ثواب ہے لیکن کلام اللہ کا حق ہے کہ اس کے مندرجات پر غور بھی کیا جائے۔ اس کتاب کا موضوع خدا قرآن اور انسان ہے۔ رسم ورواج کے کفن میں لپٹے ہوئے مذہب کی تقلید کو قرآن کی کسوٹی پر جانچنا چاہیے۔ ترجمے کے ساتھ قرآنی آیات کا پڑھنا اس لیے بھی سود مند ہے کہ انسانی علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بہت سارے تصورات واضح ہوتے ہیں۔ معاملات کی نئی جہتوں کا ادراک ہوتا ہے اور ایمان میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب کو سوال و جواب کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ جس کا محرک قرآنی متن بھی ہے۔ قرآن کا اپنا اسلوب ہے جس کے ذریعے لوگوں کے روایتی تصوات کو ایڈریس کرتا ہے۔''

271 صفحات کی اس کتاب میں تقریباً 143 سوالات مرتب کرکے، قرآن کی آیات کی روشنی میں جواب دینے ،تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن فہمی کی یہ اچھی کوشش ہے جو وضاحت کرتی ہے اور ذہن نشین کرنے میں مفید ہے۔

کتاب میں جسٹس صاحب کا تعارف درج نہیں ہے۔ کتاب کی اشاعت ''قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل'' (یثرب کالونی، بینک اسٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ) نے عبدالستار عاصم اور سلمان علی چودھری کے زیر اہتمام کی ہے۔ قیمت ہے سولہ سو روپے۔

''قرآنی و نبوی دعائیں و افکار لیل و نہار'' مرتب: محمد اقبال اعوان الخطیب

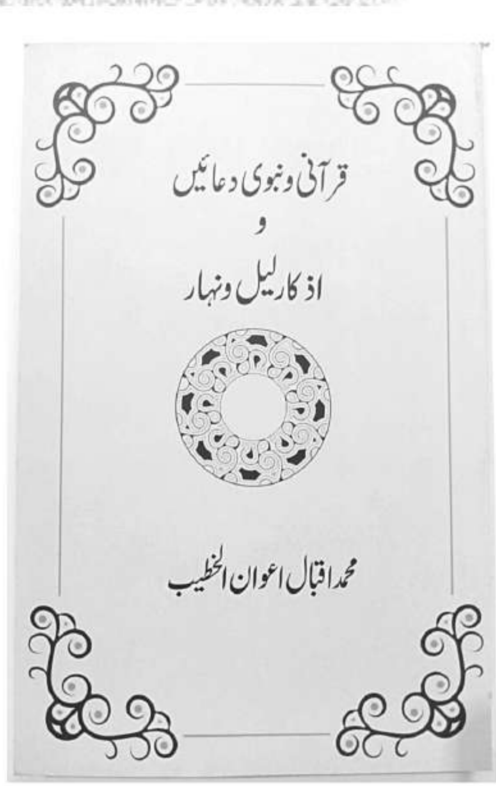

قرآنی و نبوی دعاؤں کے مرتب محمد اقبال اعوان، لوٹن (برطانیہ) کی جامع مسجد مدینہ میں امامت وخطابت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ یو کے اسلامک مشن کے مختلف عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ساتھ ہی ماہ نامہ دی مشن لندن کے مدیر بھی رہے ہیں۔ مختلف مما لک میں تبلیغی اجتماعات سے خطاب کیا ہے۔

اُن کی مرتب کردہ زیر تذکرہ کتاب سات ابواب پہ مشتمل ہے: قرآنی دعائیں و افکارِ قرآنی، نبوی دعائیں و افکار نبوی، اسماؤالحسنیٰ، طہارت و نماز، روزہ، عمرہ و حج، اہم مقامات (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ)

195 صفحات پہ مشتمل یہ کتاب بظاہر تو ضخامت میں زائد نہیں لیکن اپنے مضمون اور افادیت میں نہایت ضخیم ہے۔ قاری ایک بار پڑھنا شروع کرے اور مطالعہ مکمل کیے بغیر کتاب ہاتھ سے نہ رکھے۔ قرآن مجید میں انبیاء کی جن دعاؤں کا تذکرہ ہے اور اللہ کے آخری نبیؐ سے منسوب احادیث میں جو دعائیں ہیں انھیں اس کتابی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کو مشکل بنانے یا خود نمائی کی، ایک سطری کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔

پیپر بیک پر اس کتاب کو قلم فاؤنڈیشن نے عبدالستار عاصم اور سلمان علی چودھری کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ قیمت کا کہیں اندراج نہیں ہے۔

’’العالم الاسلامی‘‘ از: ڈاکٹر مولوی عبدالحق

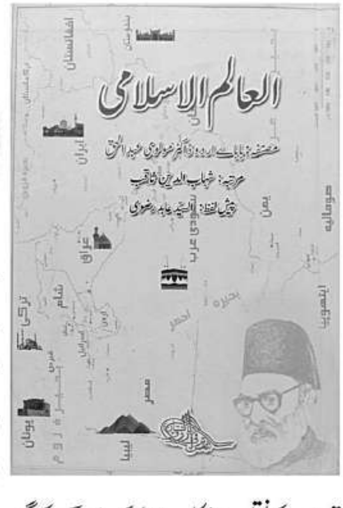

زیرِ تذکرہ کتاب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مقالے ’’العالم الاسلامی‘‘ پہ مشتمل ہے۔ اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (بھارت) کے سابق پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے مرتب کیا ہے۔ اور مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ’’بابائے اردو کا مقالہ ’’العالم اسلامی‘‘ ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی عہد کی یادگار ہے۔ اسلام پرستی کا جذبہ اور مسلمانوں کی تاریخ سے لگاؤ وراثت اور ماحول دونوں سے ملا تھا۔ مقالہ، دکن ریویو، میں بالاقساط شائع ہوا لیکن کتابی صورت میں اشاعت سے محروم رہا۔ ان کی ادبی اور لسانی خدمات پر تحقیق کے دوران راقم الحروف کو اس مقالے کی ترتیب و اشاعت کا خیال ہوا تھا۔ لیکن دکن ریویو، کے مطلوبہ شمارے کسی ایک کتب خانے میں دستیاب نہ تھے۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی خدا بخش لائبریری پٹنہ اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رجوع کر کے اس کی تمام قسطوں کی نقل بہ مشکل حاصل کر کے یکجا کی گئی۔

مولوی صاحب کا یہ مقالہ اس دور میں شائع ہوا جب ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی (1857ء) کی پچاسویں سال گرہ تھی۔ اور مولوی صاحب خود ہندوستان کی آزادی کی تمنا میں بے قرار تھے۔ ’’العالم الاسلامی‘‘ کی اہمیت یوں بھی ہے کہ آج سے 115 سال پہلے مولوی صاحب نے اس کے ذریعے غلامی، ظلم و بربریت، تشدد اور جبر و استحصال کے خلاف آواز اٹھائی تھی جب خود یورپ کے بعض ممالک بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ مقالہ قوموں کے عروج و زوال کی ایسی تصاویر پیش کرتا ہے جن میں سے بعض دلچسپ ہیں اور ان میں سے بہت سی عبرت انگیز بھی ہیں۔

مقالے کی اس کتابی شکل کا پیش لفظ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے خازن مشیر علمی و ادبی سیّد عابد رضوی نے تحریر کیا ہے۔

قارئین کرام! ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا یہ مقالہ ایک تاریخ ہے، اُس زمانے کے مختلف ممالک جیسے ترکی، مصر، ایران، افغانستان، عرب، مراکش، الجزائر، تیونس، رنجبار، چین، روس اور کتنے ہی ممالک کی تاریخ، حالات، سفر کے طریقے، رسوم و رواج، مختلف شعبوں کے نظام و انتظام، اسلام کی اشاعت اور حالات کا جائزہ لیا گیا۔ انتہائی معلوماتی مقالہ ہے جو پڑھنے والے کے تجسس و دلچسپی کو شروع سے آخر تک برقرار رکھتا ہے۔ اسے کتابی شکل میں محفوظ کر کے پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے شائع کر کے قابلِ ستائش کام کیا ہے۔ اس کی اشاعت میں، اکادمی ادبیات پاکستان کی معاونت شامل ہے۔

244 صفحات کی اس مجلد کتاب کی قیمت ہے ساڑھے آٹھ سو روپے۔

’’اطراف‘‘ کے چیف ایڈیٹر محمود شام، نیپا میں اعلیٰ افسروں سے خطاب کر رہے ہیں۔ موضوع ہے۔ ’’پاکستان سنچری 2047 کے لیے تیاریاں۔

”اطراف کو خوشی ہے کہ ممتاز خلائی سائنسداں اور انتہائی معتبر شاعر جناب ظفر محمد خان ظفر سے سیر حاصل گفتگو۔ ادیب علمی اور سائنسی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ عام طور پر شعرا سے انٹرویو علمی اور سائنسی تحقیق کے حوالے سے بات چیت نہیں ہوتی۔ اس گفتگو سے پاکستان میں سائنس کی پیشرفت بھی سامنے آتی ہے۔ ایک شاعر نے پاکستان کے وجود کا خواب دیکھا تھا۔ اب ایک شاعر نے پاکستان کی خلاؤں میں پرواز کا تصور کیا ہے۔ پڑھیئے۔ اور اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔“

دوسری اور آخری قسط

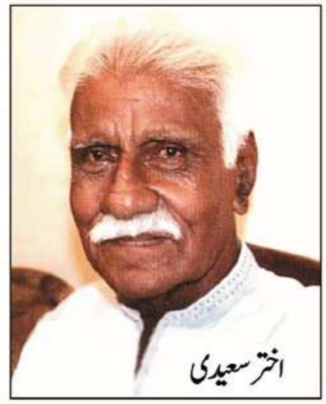

اختر سعیدی

سائنس اور ادب میرے ذہن میں خود آمیز ہو جاتے ہیں

ممتاز و معتبر شاعر، خلائی سائنس داں اور پاکستان کے خلائی اِدارے ”سُپارکو“ کراچی کے سابق ڈائریکٹر خیّامُ الپاک ظفر محمّد خان ظفرؔ سے گفتگو

س: آپ نے کینیڈا کی مشہور و معروف یونیورسٹی، یونیورسٹی آف سیسکیچوان، ساسکے ٹُون سے کون کون سے سائنسی کورسِس اور مقالے پاس کیے؟

ج: مَیں نے کینیڈا کی مندرجہ بالا یونیورسٹی میں تقریباً تین سال پانچ ماہ کا عرصہ ماسٹر آف سائنس کی ڈگری کے حصول کے لیے گزارا۔ اس عرصے کے ابتدائی سوا سال میں، مَیں نے ایک (Comprehenssive Examination) اور مندرجہ ذیل سائنسی مضامین کے امتحانات، اعلیٰ گریڈ سے پاس کیے۔

1- Classical Mechanics and Electromagnetic Theory.
2- Plasma Physics.
3- Upper Atmospheric Physics.
4- Aeronomy.
5- Quantum Mechanics.

امتحانات کی کامیابی کے بعد مجھے بالائی کُرۂ فضا کی تحقیق کی اجازت ملی اور میں نے ڈاکٹر اے ایچ مینسن (Dr. A. H. Manson) کی معیاری رہنمائی میں اپنا مقالہ بعنوان "A Study of the Quiet and Disturbed Lower Iounosphere near Solar Maximum Year (۱۹۷۰-۱۹۷۱) دو سال اور چند ماہ میں مکمّل کیا۔

اپنے مقالے کے دوران جو جون ۱۹۷۲ء کو یونیورسٹی آف البرٹا (University of Alberta) ایڈمنٹن میں اپریل ۱۹۷۳ء میں یونیورسٹی میں جمع کروایا اور کُل کینیڈا کانفرنس کے موقع پر ایک سائنٹفک پیپر بہ عنوان Electron Densities and Winds پیش کیا۔ اس Thesis سے متعلّق دو سائنسی پیپرز Candian Journal of Physics, Canada میں شائع ہوئے۔ Scientific papers اور سائنسی مقالے کی کامیاب تکمیل کے بعد مجھے متذکرہ بالا کینیڈا کی یونیورسٹی نے Master of Science کی ڈگری سے نوازا۔ بعد ازاں مَیں کینیڈا سے واپس ہوا اور ۵ رجون ۱۹۷۳ء کو پاکستان کے خلائی ادارے سُپارکو میں Joining report دی۔

س: کینیڈا میں قیام کے دوران دیگر سائنسی سرگرمیوں پر روشنی ڈالیں؟

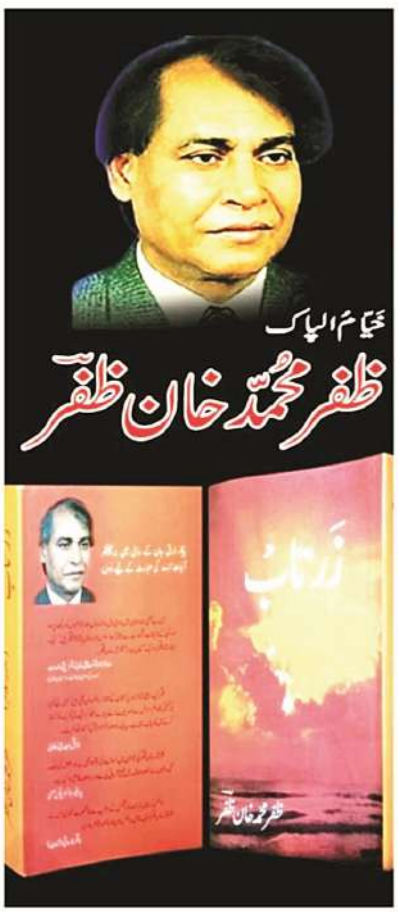

ظفر محمد خان ظفرؔ کی سہرابندی کے موقع پر لی گئی ایک اور تصویر۔ دائیں سے: ریاض الرحمٰن، عمار، قمر محمد خان، ظفر محمد خان، حُسن آرا ظفر، عرشیہ بیگم اور آمنہ خاتون، دائیں سے (کھڑے ہوئے): انیس الرحمٰن، قمر جہاں، دانش قمر، ظفر جہاں

مجھے بالائی کرۂ فضائی کی تحقیق کی اجازت مل گئی

ج: میرے کینیڈا میں قیام کے دوران دیگر سائنسی سرگرمیوں میں اوٹاوا(Ottawa)اور ایڈمنٹن(Edminton) کے دورے شامل ہیں۔ میرے گائیڈ ڈاکٹر اے ایچ مینسن (Dr. A. H. Manson) کی پُرخلوص کوششوں سے میرا اوٹاوا کا دورہ سائنسی مقاصد کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ نیشنل ریسرچ کونسل اور کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر کا وزٹ کرنے اور ان اداروں سے منسلک بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دانوں ڈاکٹر ٹی آر ہارٹس (Dr T.R. Hartz)، ڈاکٹر جے ایس بیلروز (Dr. J. S. Belrose)، ڈاکٹر جے آر بروز (Dr. J. R. Burrows)اور دیگر کئی مقتدر سائنسدانوں سے ملاقات کا نادر موقع ملا۔ اسی طرح ڈاکٹر اے ایچ مینسن کی مخلصانہ کوششوں سے مجھے ایڈمنٹن میں منعقدہ کینیڈین ایسوسی ایشن آف فزکس (CAP) ۱۹۷۲ء میں اپنا سائنسی پیپر، بہ عنوان Electron Densities and Winds پیش

شاہین بیگم شاہینؔ کے دوشعری مجموعوں کی تقریب پذیرائی مورخہ ۶ رجولائی ۲۰۰۹ء کا ایک گروپ فوٹو۔
دائیں سے: سیما حنیف، حُسن آرا ظفر، شاہین بیگم شاہین، فرح رحمٰن، ظفر محمد خان ظفر، رخسانہ انیس، انیس الرحمٰن اور عروج رحمٰن

کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

س: قارئین کی دلچسپی کے لیے آپ ذیل اصطلاحات کی تشریح فرمائیں (۱) زمینی کُرۂ رواں (Earth`s Ionosphere) اَور (۲) خلا (Space)

اربوں کہکشاؤں پر مشتمل منور کا نشان خلا میں جلوہ گر

ج: (۱) زمینی کُرۂ رواں: زمین کے ''کُرۂ آب وہوا'' کا وہ حصّہ، جو سطحِ زمین سے ۸۰ تا ۸۰۰ کلومیٹر کی بُلندی کے درمیان واقع ہے ،کُرۂ رواں کہلاتا ہے۔ کُرۂ رواں میں آزاد برقیاتی (Free Electrons) بھی پائے جاتے ہیں ،جن سے منعکس (Reflect) ہو کر بُلند تعدّد ریڈیائی لہریں (High Frequency Radiowaves) واپس زمین کا رُخ کرتی ہیں اور مواصلاتی رابطے کا ذریعہ بنتی ہیں ۔ آپ ریڈیائی لہروں (Radiowaves) کو سواری کا ایک ذریعہ (Vehicle) تصوّر کرسکتے ہیں، جس پر آپ کی آواز، سوار ہو کر سیکنڈوں میں ایک مقام سے دوسرے مطلوبہ دُور دراز مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ ریڈیائی لہریں، روشنی کی رفتار سے فاصلہ طے کرتی ہیں۔ گویا ''کُرۂ رواں'' کُرۂ آب وہَوا کے دوش پر رکھا قدرت کا ایسا آئینہ ہے، جس کی وجہ سے دُنیا میں بُلند تعدّد مَواصلاتی رابطہ (High Frequency Communication) ممکن ہوتا ہے۔

(۲) خلا : عظیم سائنس دان سَر اساک نیوٹن نے باغ میں بیٹھ کر، پیڑ سے زمین پر گرنے والے سیب سے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین ہر شئی کو اپنے مرکز (Centre) کی طرف کھینچتی ہے۔ اُس نے یہ بھی ثابت کیا کہ یہ قوت، یعنی کششِ ثقل، کسی چیز کا زمین سے فاصلہ کم ہونے پر بڑھتی اور فاصلہ زیادہ ہونے پر گھٹتی ہے۔ کُرۂ زمین کے حوالے سے خلاء سطحِ زمین سے ۱۲۰ میل دُوری کے فاصلے پر شروع ہوتا ہے' جہاں زمین کی کششِ ثقل ختم ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے دریافت کرے کہ کیا خلاء ایک Empty Place یعنی خالی مقام ہے تو بلا خوفِ تردید مَیں اُسے بڑے اَدب سے جواب دوں گا، نہیں، قطعاً نہیں۔ خلاء قدرت کا ایک بے مثال و بے بہا حسین نگار خانہ ہے۔

خلا قدرت کا ایک بے مثال نگار خانہ ہے

خلاء قدرت کا حیرت کدہ ہے، جس کے نظارے سے انسان محوِ حیرت ہے۔ انسان، محوِ حیرت کیوں نہ ہو کہ مختلف قسم کی اَربوں کہکشاؤں پر مشتمل یہ منوّر کائنات، خلاء میں جلوہ گر ہے۔ یہ زمین، وہ سورج، یہ چاند، وہ ستارے، رات کو ستاروں سے جگمگاتا یہ نیلا فلک اَور فلک پر زمین کے سیّارے کی وہ دُودھیا کہکشاں، یہ تمام پُرنور اجسام مل کر بھی خلاء میں موجود کائنات کا عشرِ عشیر نہیں۔ مرزا غالبؔ نے خلاء میں موجود ''بَناتُ النّعشِ گردُوں'' یعنی سات ستاروں کے جھمکے یا عقدِ ثریّا پر کیا خوب شعر کہا ہے:

تھیں بَناتُ النّعشِ گردُوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں

خلاء میں کہیں پلیٹینم، سونے، چاندی اور جواہر کی کانیں تیر رہی ہیں تو کہیں ہیروں کے بادل دمک رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اپنے ہَبل ٹیلس کوپ (Hubble Telescope) کے ذریعے خلاء کا مسلسل مشاہدہ کر رہا ہے۔ سُرخ رنگ کی منتقلی (Red Shift) کا قدرتی عمل (Natural Phenomenon) بتا رہا ہے کہ کائنات، خلاء میں مسلسل پھیل رہی ہے۔ مَیں اس سوال کے جواب کا اختتام، اس پھیلتی ہوئی کائنات کے حوالے سے اپنے اس شعر پر کرتا ہوں:

پھیلتی ہی جا رہی ہے اے خُدا! یہ کائنات
ہاتھ دھو بیٹھیں نہ اِک دن کائناتِ دل سے ہم

س: آپ شاعر بھی ہیں، خلائی سائنسدان بھی، خلا کے موضوع پر کوئی شعر عطا ہو؟

ظفر محمد خان ظفرؔ کی اپنی اہلیہ حُسن آراء ظفر کے ساتھ ایک یادگار تصویر (شالامار باغ لاہور، 10 اکتوبر 2010ء)

ج: خلا کے موضوع پر، میرا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہم نے کاٹی ہیں ہجر کی راتیں
ہم کو معلوم ہے خلا کیا ہے

ج: نیوٹن، برطانیہ کے عظیم ریاضی دان، سائنس دان، طبیعات دان اور ماہرِ فلکیات تھے۔ وہ انگلینڈ کے ایک چھوٹے سے دیہات میں ۴؍جنوری ۱۶۴۳ء کو پیدا ہوئے اور اُن کا انتقال ۳۱؍مارچ ۱۷۲۷ء کو

آئرن (Ni-Iron) بیٹری وغیرہ۔ الیکٹرک بلب، ایڈیسن کی وہ شہرۂ آفاق ایجاد ہے، جس نے دنیا کے ظلمت کدے کو منوّر و درخشاں کر دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ نیوٹن اور ایڈیسن، دونوں کے نام، ہم قافیہ ہیں اور دونوں میں 'ن' مشترک ہے نیز دونوں نے زندگی میں دنیا کی ۸۴ بہاریں دیکھیں۔ نیوٹن، بستر پر مُردہ حالت میں پائے گئے، جبکہ ایڈیسن کو شوگر کی پیچیدگیوں نے مار ڈالا۔

س: پاکستان، دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہے، اس حوالے سے جوہری عنصر ''یُورینیم'' کے متعلق، قارئین کو تفصیلاً بتائیں؟

ج: خالص یُورینیم سِلور وھائٹ کلر کا میٹل ہے جو زمینی چٹانوں، پانیوں اور Soil میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک تابکار (Radioactive) میٹل ہے جو Alpha Rays خارج کرتا ہے۔ یہ ریز انسانی جلد پر پڑ کر جلد کا کینسر (Skin Cancer) پیدا کرسکتی اور سانس کے ذریعے پھیپھڑوں اور گردوں کے کینسر میں مبتلا کرسکتی ہیں۔ یُورینیم زمین پہ قدرتی طور پر پائے جانے والے عناصر مثلاً سونے، چاندی، مرکری وغیرہ کی نسبت کثرت سے پایا

یُورینیم کی افزودگی کا سہرا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے سر ہے

س: کیا ہماری قوم میں سائنسی شعور ہے؟

ج: اگر ہماری قوم میں سائنسی شعور نہ ہوتا تو ہم آج دنیا کی

ساتویں ایٹمی طاقت نہ ہوتے۔

س: آپ نے اُدب اور سائنس کو ہم آمیز کیسے کیا؟

ج: مجھے بچپن ہی سے اَدب (خصوصاً شاعری) اور سائنس میں خُداداد دلچسپی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعری اَور سائنس سے مجھے عشق تھا تو غلط نہ ہوگا، لہٰذا سائنسی و غیر سائنسی اشعار میرے ذہن میں قدرتاً آتے ہیں، جس طرح کنویں میں پانی کی سیریں پھوٹتی ہیں یا کوہسار پر پانی کے چشمے اُبلتے ہیں، اسی طرح میرے دماغ میں بھی تخلیق کی سیریں یا چشمے پھوٹتے ہیں۔ میں شعوری طور پر اَدب اور سائنس کو ہم آمیز نہیں کرتا۔ میں تو صرف بحرِ فکر میں ڈُوب جاتا ہوں، سائنس اور اَدب، میرے ذہن میں، خود بخود ہم آمیز ہوجاتے ہیں۔

س: برطانوی سائنسدان، سَر اساک نیوٹن اور امریکی سائنس دان تھامس ایلوا ایڈیسن (Thomas Alva Edison) کے بارے میں آگاہ فرمائیں؟

لندن میں ہوا۔ نیوٹن، دُنیا کے وہ واحد عظیم سائنسدان ہیں کہ جن کو اُس عہد کی ملکۂ عالیہ نے کمالِ عزّت اور احترام کے ساتھ شاہی اعزاز و تکریم سے نوازا تھا۔ زمینی کششِ ثقل، عالمی کششِ ثقل (Universal Gravitation) اور تین قوانینِ حرکت (Three Laws of Motion) اُن کی عظیم دریافت ہیں۔ کیل کُلس (Calculus)، نیوٹونین میکینکس (Newtonian Mechanics) اُن کی معرکۃ الآراء ایجاد ہیں۔ نیوٹن نے یونیورسٹی آف کیمبرج میں بطور سائنسی پروفیسر درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اس یونیورسٹی نے انہیں ایف، آر، ایس (FRS) یعنی Fellow of Royal Society کا اعزاز عطا کیا۔

بزمِ سائنسی اَدب کی ۳۱۴ ویں ماہانہ نشست کے مقررین و انعام یافتگان

بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں: اختر سعیدی، خیام الپاک ظفر محمد خان ظفرؔ (صدر بزم) کیپٹن (ر) شاہ رخ خان (صدر نشست) اور علی ارشد کھڑے ہوئے: صلاح الدین غازی، خالد حنیف، نبیل احمد، وسیم فارقی، رضی الدین سیّد، آمنہ عالم، شفق اعظم اور عروج رحمٰن

تھامس ایلوا ایڈیسن، امریکا کے عظیم طبیعات دان، موجد اور بزنس مین تھے۔ وہ امریکہ کے شہر مِلن، اوہایو (Milan,Ohio) میں ۱۱؍فروری ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوئے اور ویسٹ اورینج، نیوجرسی میں اس جہانِ فانی سے ۱۸؍اکتوبر ۱۹۳۱ء کو کُوچ کر گئے۔ ایڈیسن کی متعدد سائنسی دریافت و ایجادات ہیں، مثلاً الٹرنیٹنگ کرنٹ (Alternating Current) کا خطرناک ہونا، نکل۔

جاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ AtomicWeight کا حامل عنصر ہے، لہٰذا یُورینیم دنیا میں پائے جانے والے Metallic Elements میں سب سے Dense یعنی بھاری اور سخت میٹل ہے۔ یُورینیم کو جرمن سائنس دان مارٹن ہائن رِچ کلیپ روتھ (Martin Heinrich Klaproth) نے ۱۷۸۹ء میں دریافت کیا تھا۔ یُورینیم نیول شپز اور آبدوزوں کو

ایندھن (Fuel) فراہم کرتا ہے۔ایسے شپز اور آبدوزوں کو اٹامک شپز (Atomic Ships) اور اٹامک آبدوز (Submarines) کہا جاتا ہے۔یُورینیم کا استعمال نیوکلیئر ری

بزمِ سائنسی اَدب کی ۱۰۳ویں ماہانہ نشست کی ایک یادگار تصور

(دائیں سے بائیں) شریک معتمد بزم صلاح الدین غازی، (نشستوں پر) مہمانِ خصوصی پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ مقصود، صدر بزمِ سائنسی ادب خیام الپاک ظفر محمد خان ظفر، صدرِ نشست محمود شام، مہمانِ اعزازی اختر سعیدی

ایکٹر میں بھی بطور ایندھن ہوتا ہے۔ یُورینیم کے دو'' ہم جا'' (Isotopes) ہوتے ہیں ، ایک U-235 اور دوسرا U-238۔ یہاں U یُورینیم کی علامت ہے۔ ایٹم بم کی تشکیل میں یُورینیم کے ''ہم جا'' U-235 کی افزودگی (Enrichment) کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں یُورینیم۔ 235 کی افزودگی کا کریڈٹ بلاشبہ محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو جاتا ہے۔ شمسی نظام کے سیّارے یُورینَس (Uranus) میں یُورینیم بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس عنصر کا نام یُورینَس سیّارے کے نام پر ہی یُورینیم رکھا گیا ہے۔

س: قارئین کی معلومات کے لیے Space Race یعنی خلائی دوڑ کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

ج: عالمی جنگِ دوم (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء تا ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء) کے اختتام کے بعد دُنیا کی دو حریف سُپر پاورز امریکہ اور سوویت یونین (روس) میں سرد جنگ چھڑ گئی اور ان سُپر پاورز نے دنیا بھر میں اپنی حاکمیت (Supermacy) قائم کرنا چاہی، نتیجتاً ''خلائی دوڑ'' کے دور کا آغاز ہوا۔ روس نے تاریخ میں پہلی بار اپنا Sputnick-1 سٹیلائٹ زمین کے مدار میں، ۴/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو کامیابی کے ساتھ لانچ کیا اور یوں چشمِ انسانی نے پہلی بار کسی زمینی مصنوعی سیّارے (Satellite) کا نظارہ کیا۔اس سے قبل انسان ،صدیوں سے صرف زمین کے قدرتی سیّارے (Earth`s Satellite) ''چاند'' کا نظارہ کرتا چلا آیا تھا۔ روس کے متذکّرہ سٹیلائٹ سے تین ہفتے تک باقاعدگی سے زمین پر ریڈیو سگنلز موصول ہوتے رہے، یہاں تک کہ اس کی تینوں سِلور۔ زنک بیٹریوں کا چارج ختم ہوگیا۔

''پاک سیٹ'' رَقصاں ہے چاند کے مدار میں

رُوس کی خلائی میدان میں متذکّرہ شاندار کامیابی کے بعد امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے ۱۹۶۱ء میں اعلان کیا کہ امریکہ چاند پر انسان بردار مشن بھیجے گا ، لہٰذا امریکن خلائی ادارے ناسا (NASA) نے ابتدا میں کچھ ناکامیوں کے بعد ۲۰ رجولائی ۱۹۶۹ء کو واضح کامیابی حاصل کی، جب اس کے Apollo11 مِشن نے چاند کے پہلے سے طے شدہ ہموار (Flate) اور محفوظ (Safe) مقام Sea of Tranquillity پر بحفاظت لینڈ کیا اور امریکی خلانورد (Astronaut) نیل آرم اسٹرونگ نے تاریخ میں چاند کی سطح پر پہلا انسانی قدم رکھا، اس کے فوراً بعد دوسرے خلانورد بز ایلڈرن (Buzz Aldrin) نے اور پھر دونوں خلانوردوں نے چاند پر چہل قدمی کی جبکہ تیسرا خلانورد Collins اپنے Command Module Columbus میں چاند کے مدار (Lunar Orbit) میں ڈھائی دن تک چاند کے چکّر کاٹتا رہا۔ نیل آرم اسٹرونگ اور بز ایلڈرن دونوں خلانوردوں نے چاند پر امریکہ کا پرچم لہرایا، امریکی صدر رچرڈ نکسن سے مختصر بات کی اور چاند کی مٹّی اور پتھرّوں کے 21.6 کلوگرام وزنی نمونے اکٹھے کیے۔ چاند پر اِن دونوں خلانوردوں کا قیام تقریباً ڈھائی گھنٹے رہا۔ Apollo11 چاند پر اپنا مشن مکمّل کر کے ۲۴ رجولائی ۱۹۶۹ء کو ہوائی (Hawaii) شہر کے جنوب مغرب میں واقع بحر الکاہل (Pacific Ocean) میں بحفاظت اُتر گیا۔ اس یادگار سنہری منظر کے نظارے پر چشمِ انسانی ہنوز محوِ حیرت ہے، اس کی حیرانی نہیں جاتی۔ جنگِ عظیم دوم اور خلائی دوڑ (Space Race) کے حوالے سے میرا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

چین کے اشتراک سے آئی ''کیوب قمر'' وجود میں آیا

لگا کر پَر ذہانت کے اُڑے جاتے ہیں بے پَر لوگ
خلا زاروں میں بھی گاہے ٹہلتے ہیں یہ خود سَر لوگ
زمیں کو خوں میں نہلا کر چلے ہیں جانبِ مہتاب
چراغِ ماہِ تابندہ نہ گُل کردیں، سِتم گر لوگ

میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔
واضح رہے کہ چین کا خلائی راکٹ چاند کے مدار میں داخل ہوتے ہی پاکستان کا پہلا قمری سیٹلائٹ ''آئی کیوب قمر'' چین کے قمری مشن ''چانگ، ای 6'' سے جدا ہوا اور اُس نے چاند کی ''کششِ ثقل'' کی عمر کا اندازہ ۳ سے ٦ ماہ لگایا گیا ہے۔ چین کا خلائی راکٹ چین کے قمری مشن کی تکمیل کے بعد ۲۵ رجون ۲۰۲۴ء کو زمین پر لینڈ کرگیا۔ واپسی میں چین کا قمری مشن چاند کی مٹّی اور چٹانوں کے نمونے بھی لایا۔ اِن نمونوں پر تحقیق سے چینی سائنسدان چاند کی ساخت، تاریخ اور تشکیل کے بارے میں چونکا دینے والے انکشافات کرسکتے ہیں۔ اگر چاند کے جنوبی عقبی حصّے (جو ہمیشہ تاریک رہتا ہے) سے لائے گئے مٹّی اور چٹانوں کے نمونوں میں پانی پایا جاتا ہے تو یہ زندگی کی علامت کا مظہر ہوگا۔ یوں چین اس تحقیق میں سبقت لے جاسکتا ہے۔ اَب مَیں اس جواب کا اختتام اپنے مندرجہ ذیل قطعہ پر کرتا ہوں:

ہم سب طلبہ دریا میں ڈوبنے سے بال بال بچ گئے

س: چین کے قمری مشن ''چانگ ای 6'' پر روشنی ڈالیے اَور پاکستان کے پہلے قمری سیٹلائٹ ''آئی کیوب قمر'' کے بارے میں تفصیل سے آگاہ فرمائیں؟

کے زیرِ اثر چاند کے مدار میں چکّر کاٹنا شروع کردیئے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی کامیابی ہے، جس کا کریڈٹ پاکستان کے قومی خلائی ادارے سُپارکو کے سائنسدانوں، انجینئرز اور چین کی شنگھائی

ظفر محمد خان ظفرؔ (پہلی صف میں بائیں سے پہلے نمبر پر) یونیورسٹی آف سیسکیچوان، ساسکے ٹُون کی فٹبال ٹیم میں۔ تصویر بمقام ایڈمنٹن (کینیڈا)۔

ج: چین نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنا قمری مشن ''چانگ ای6'' چاند کے جنوبی عقبی تاریک رُخ پر تحقیق کے لیے روانہ کیا۔ چین کا یہ قمری مشن فرانس، سویڈن، اِٹلی اور پاکستان کے Payloads یعنی سائنسی آلات سے لیس ہوکر چاند کے اِسی عقبی رُخ/حصّے پر تحقیق کے لیے چین کے جنوب میں واقع شہر حینان کے لانچنگ پیڈ سے چینی خلائی راکٹ ''لانگ مارچ5'' کے ذریعے ۳رمئی ۲۰۲۴ء کو چاند کے سفر پر روانہ ہوا۔ چین کا یہ خلائی راکٹ ۸ مئی ۲۰۲۴ء کو کامیابی کے ساتھ چاند کے جنوبی عقبی حصّے میں اُترا اور وہاں فرانس، اٹلی و سویڈن کے سائنسی آلات نصب کیے۔ متذکرہ ممالک Radon، Passive Laser Retroreflector اور Negative ions on the Lunar Surface کی پیمائش

یونیورسٹی کے طلبا کو جاتا ہے اور وہ اہلِ پاکستان کی دلی مبارکباد کے حقدار ہیں۔ یاد رہے کہ سُپارکو کے Institute of Space Technology (IST) اور چین کی شنگھائی یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے پاکستان کے پہلے سیٹلائٹ ''آئی کیوب قمر'' کا ڈیزائن اور ڈیولپمنٹ وجود میں آیا۔ ''آئی کیوب قمر'' کے دو آپٹیکل کیمروں سے ۸رمئی ۲۰۲۴ء کو لی گئیں چاند، سورج اور زمین کی تصاویر بھی سُپارکو، اسلام آباد کے IST وِنگ کو موصول ہوچکی ہیں۔ چاند کے مدار میں بھیجے گئے پاکستان کے پہلے سیٹلائٹ

آخرش! یہ خواب بھی آج سچّا ہوگیا
دل تھا قید صدیوں سے چاند کے حصار میں
پاک چین دوستی، یا الٰہی زندہ باد
''پاک سیٹ'' رَقصاں ہے چاند کے مدار میں

چاند پر مزید تحقیق میں چین سبقت لے جاسکتا ہے

س: زمین سے چاند کا فاصلہ کتنا ہے؟

ج: زمین سی چاند کا فاصلہ 3,84,400 کلومیٹر ہے۔

س: ہماری معلومات کے مطابق، آپ کی نظموں ''اے سرزمینِ چاغی'' اور ''ناقابلِ تسخیر ہے شاہین مزائل'' کو قومی سطح پر سراہا گیا ہے،

دل تھا قید صدیوں سے چاند کے حصار میں
پاک چین دوستی، یا الٰہی زندہ باد
''پاک سیٹ'' رقصاں ہے چاند کے مدار میں

س: زمین سے چاند کا فاصلہ کتنا ہے؟

قومی خلائی ادارے میں 36 سال سائنسی خدمات انجام دیں

ج: زمین سی چاند کا فاصلہ 3,84,400 کلومیٹر ہے۔

س: ہماری معلومات کے مطابق، آپ کی نظموں ''اے سرزمینِ

چاغی'' اور ''ناقابلِ تسخیر ہے شاہین مزائل'' کو قومی سطح پر سراہا گیا ہے، اِس حوالے سے کچھ فرمائیں؟

ج: آپ تک پہنچنے والی اطلاع، بالکل درست ہے۔ جب مَیں نے یومِ تکبیر کے موقع پر اپنی نظم ''اے سرزمینِ چاغی'' اُس وقت کے

15 اگست 1939 کو ہونے والے منتظم میرے والد گرامی تھے

وزیرِ اعظم پاکستان، عزّت مآب، جناب میاں محمد نواز شریف کو پہنچائی تو اُن کی طرف سے ایک توصیفی خط مؤرخہ ۱۱ر جون ۱۹۹۹ء موصول ہوا، جس میں انہوں نے میرے جذبۂ حُبّ الوطنی کو سراہا اور مجھے مُبارکباد بھی دی۔ میری نظم ''ناقابلِ تسخیر ہے شاہین مزائل'' پر بھی مجھے وزیرِ اعظم پاکستان، جناب میاں محمد نواز شریف کے

پرنسپل اسٹاف آفیسر، جناب خیّام قیصر کی جانب سے ایک تہنیتی خط مؤرخہ ۱۰ر مئی ۱۹۹۹ء نظر نواز ہوا، جس میں، میری اِس کاوش کو خوبصورت اور حوصلہ افزا الفاظ میں خراجِ مَحبّت پیش کیا گیا۔ دریں اثناء اِسی متذکّرہ نظم سے متعلّق ''ایوانِ صدر'' (اسلام آباد) سے اُس وقت کے صدرِ مملکت، عزّت مآب، جناب محمد رفیق تارڑ کی جانب سے بھی مبارکباد اور شکریے کا ایک خط مؤرخہ ۱۵ر مئی ۱۹۹۹ء موصول ہوا۔

مندرجہ بالا (Very Very Important Personalities) VVIPs کے مشفقانہ خطوط میرے لیے باعثِ فخر و صد افتخار ہیں اور سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ مَیں اِس عزّت افزائی پر جناب میاں محمد نواز شریف (سابق وزیرِ اعظم پاکستان) اور جناب محمد رفیق تارڑ (سابق صدرِ مملکت) کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ مذکورہ توصیفی خطوط میرا قیمتی اثاثہ ہیں، جنہیں پڑھ کر مَیں کل بھی طمانیت محسوس کرتا تھا اور آج بھی طمانیت حاصل کرتا ہوں۔

س: اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ؟

ج: مَیں اپنی زندگی کے ایک نہیں بلکہ دو ناقابلِ فراموش واقعات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، ایک نجی زندگی کا اور دوسرا ادبی زندگی کا۔

میرے والدِ محترم زبیرؔ حیدری کی ایک بیاض کے مطابق ۵ر اگست ۱۹۳۹ء کو ''ادارۂ حیدر'' کے زیرِ اہتمام دہلی میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا، جس کا مصرعۂ طرح تھا ''کہاں سکوں میں وہ لذّت جو اضطراب میں ہے'' جس کے منتظمِ اعلیٰ، میرے والدِ گرامی، محمد زبیر خان زبیرؔ حیدری، ٹونکی تھے' جن کا شمار، خیّامُ الہند، سیّد جلال الدّین حیدرؔ دہلوی کے جلیل القدر شاگردوں میں ہوتا ہے۔ مشاعرے کی صدارت، حضرت جلال الدّین حیدرؔ دہلوی نے فرمائی۔ اِس موقع پر اُنہوں نے اپنے شاگردِ رشید، محمد خورشید حسن نازشؔ حیدری، دہلوی کو فارغ الاصلاح کیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل الدّین عالیؔ، یہ وہی مشاعرہ ہے جس میں اُنہوں نے اپنی زندگی کی پہلی غزل پیش کی تھی۔ عالیؔ جی، اِس تاریخ (۵ر اگست ۱۹۳۹ء) کو جاننے کے لیے عمر بھر بیتاب و کوشاں رہے، جس کا تذکرہ اُنہوں نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں شائع ہونے والے اپنے متعدد کالموں میں بھی کیا تھا۔

میری زندگی کا دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ یہ ہے کہ مَیں جب ٹونک' راجستھان (بھارت) میں پرائمری اسکول کا طالبِ علم تھا، ہمارے اُساتذہ ایک دن اسکول کے طلبہ کو پکنک کے لیے نوابِ ٹونک کی سُنہری کوٹھی لے گئے۔ سُنہری کوٹھی سونے کے کام سے مزیّن ایک خوبصورت یادگارِ عہدِ نوابِ ٹونک ہے' جو حسین دریائے باناس کے قریب پکّے بندے کے پُرفضا مقام پر ٹونک شہر سے آتے وقت سڑک کے داہنی طرف واقع ہے۔ ہم آٹھ' دس طلبہ کا ایک گروپ سڑک کے بائیں طرف واقع پہاڑوں پر چڑھ گیا' پھر وہاں سے اُتر کر ایک جگہ دریائے باناس کے بہتے ہوئے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور مناظرِ فطرت سے محظوظ ہونے لگا۔ یکا یک مَیں نے ایک زور دار دھماکے کی آواز سُنی اور مَیں فوراً وہاں سے یہ کہتے ہوئے بھاگا کہ ''بھاگو!'' خوش قسمتی سے میرے دوست بھی اُس جگہ سے بھاگ نکلے۔ ابھی ہم نے اُس جگہ کو چھوڑا ہی تھا کہ وہ جگہ دریا بُرد ہوگئی۔ یوں ہم سب طلبہ دریائے باناس میں ڈوبنے سے بال بال بچ گئے۔ اب مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دھماکہ، جہاں ہم دریا کے پانی میں پیر لٹکائے بیٹھے تھے، اُس جگہ کے نیچے مٹّی کا ایک بڑا تودہ پانی میں گرنے سے پیدا ہوا تھا اور وہ ہمارے لیے قدرت کا اِنتباہ تھا' جس پر ہم بچّوں نے بروقت عمل کیا اور محفوظ رہے۔ ❀

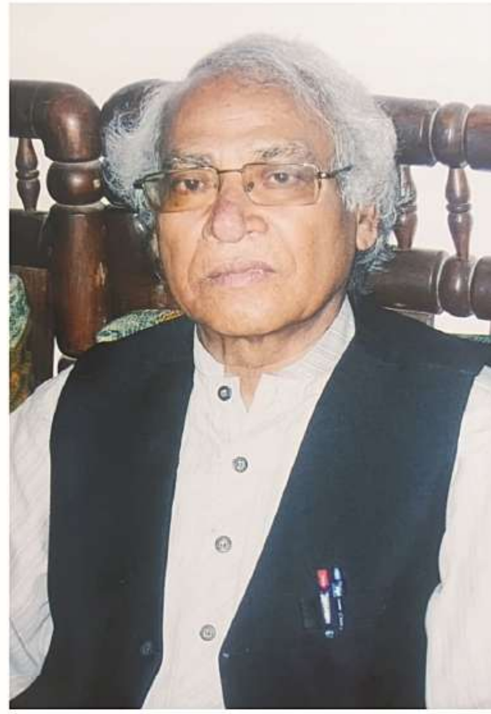

ظفر محمد خان ظفر کی غزلوں کے منتخب اَشعار

اے طالبانِ اَطلس و کمخواب، ہوشیار!
ریشم سے کٹ گئی ہے رگِ جاں کبھی کبھی

☆

باغوں میں جھولا جھولنا تم شوق سے، مگر
ایسا نہ ہو کہ شاخِ ثمر دار گر پڑے

☆

پڑاؤ ڈالے ہے ہر لمحہ کوئی لشکرِ غم
دیارِ دل بھی ہے گویا کہ چھاؤنی کی طرح

☆

اُن کے بالوں میں جو سجا ہوتا
کاش! وہ پھول مَیں بنا ہوتا

☆

بکھرنے کا اُس مَرمَریں جسم پر
بہت چاندنی کو بھی ارمان ہے

☆

''کوئی تازہ غزل'' کہا اُس نے
پیار کے ریشمی اشاروں سے

☆

یہ دُنیا بنی ہے گلوبل وِلیج ایک
محبت کے نغمے سُنا چاہتا ہُوں

☆

دل ہمارا ہے صَندل کا جنگل ظفر
شوق سے ساری دُنیا جلائے ہمیں

ظفر محمد خان ظفر کے منتخب سائنسی اَشعار

سفر سیّاروں کا درکار ہے اَب نوعِ انساں کو
اے جسمِ آدمِ خاکی! سراپا نور ہو جانا

☆

کیا زمیں تُونے دِیا زہر ''انتشارِ نور'' کا؟
آسماں کا جسم آخر کس لیے نیلا ہُوا!

☆

زمیں کا دِل ہِلا ڈالا ہے ایٹم کے دھماکوں سے
زمیں زادوں کی یارب! فتنہ سامانی نہیں جاتی

☆

نیست و نابُود کیا آن میں ناگاساکی
اَب نہ کہنا کبھی بھولے سے بھی ذرّہ کیا ہے!

☆

مَیں چکّر زمیں کے لگاتا ہُوں کب سے!
قمر ہُوں، زمیں کی ہَوا چاہتا ہُوں

☆

نِگل نہ جائے کہیں سُرخ دیو سُورج کا
سلامتی کی دُعا مانگیے جہاں کے لیے

دائیں سے بائیں۔ اقبال خان، ظفر محمد خان ظفر، ڈاکٹر نزہت عباسی، پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی۔

Kundun

Now Introduces 3 - 5 Pieces New Design Trolly Bags With Small Beauty Case Different Colour
Original Fiber Material JIAN LUGGAGE Is The Best Way For Travelling

Also Deals in Shawls , Kashmir Shalws, Pashmina, Embroidery
Shahtoosh, Kalamkar & Jamawar

Address: Adullah Haroon Road Opp. Hotel Metropole.
Ph: +92 21 35686641-42 Fax: +92 21 35684349

اپنے گھر کا خواب آپ دیکھیں۔۔۔۔ تعبیر ہم دیں گے
بن احسان گرین سٹی
خواب سے تعبیر تک۔۔۔۔ تعبیر سے تعمیر تک
تعمیر سے تکمیل تک
بن احسان آپ کے ساتھ
APPROVED BY
SDA & SBCA
APPROVED BY
ملیر ایکسپریس وے کی تکمیل کے ساتھ بن احسان کا شہر سے راستہ صرف چند منٹ کی ڈرائیو پر
M9 موٹروے کی شاندار لوکیشن پر
اپنا لیزڈ پلاٹ حاصل کریں
ترقیاتی کام تکمیل کے آخری مراحل میں
FOR BOOKING & DETAILS:
A PROJECT OF:
HMN
HOLDINGS
YOUR DREAM, YOUR VISION, OUR PRIORITY
بن احسان
BIN AHSAN
Builders & Developers
CALL NOW: 0330-2135551